ڈاکٹر رشید جہاں
شعلۂ جوّالہ

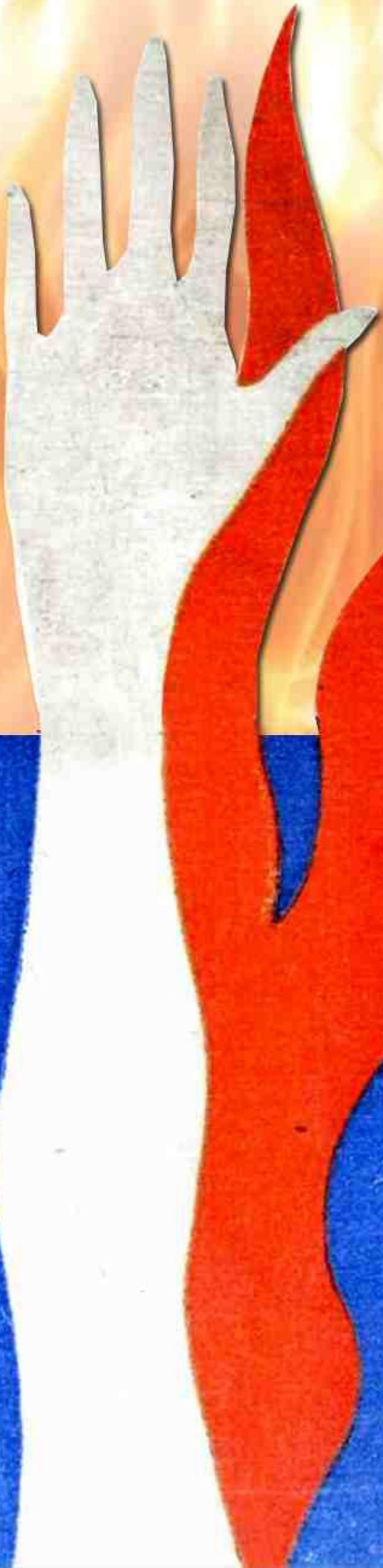

www.taemeernews.com

شعلۂ جوّالہ

(افسانے)

ڈاکٹر رشید جہاں

https://www.taemeernews.com//2020/03/shola-jawwala-rasheed-jahan-pdf.html

ڈاکٹر رشید جہاں

004 www.taemeernews.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	کہانی	صفحہ
ا	پیش لفظ	6
ب	رشیدہ آپا	9
ج	رشید جہاں — ایک تاثر	19
د	یادیں	28
ھ	ڈاکٹر رشید جہاں کی قبر پر	34
1	افطاری	37
2	مجرم کون	48

005
www.taemeernews.com

نمبر شمار	کہانی	صفحہ
3	چھیدا کی ماں	64
4	فیصلہ	75
5	صفر	96
6	آصف جہاں کی بہو	106
7	وہ	116
8	ساس اور بہو	121
9	چور	128
10	اندھے کی لاٹھی	136
11	وہ جل گئی	147
12	انصاف	159
13	بے زبان	164
14	مرد و عورت	175
15	سلمہ	183

006 www.taemeernews.com

پیش لفظ

شائقینِ اُردو ادب کے لئے ڈاکٹر رشید جہاں کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے بانیوں میں سے رہی ہیں۔ بنیادی طور سے وہ ڈاکٹر تھیں مگر کہانیاں لکھنا ان کا محبوب مشغلہ رہا۔ ہر چند ان کی ادبی تصانیف بکثرت نہیں ہیں تاہم انھوں نے جتنا چھپوایا اس سے کہیں زیادہ لکھا۔ ایک ناول کا خاکہ بھی ان کے ذہن میں تھا جس کا ذکر اکثر وہ اپنی زندگی کے آخری دَور میں کیا کرتی تھیں۔ اس طرح بہت سی کہانیوں، افسانوں، اور ڈراموں کے مکمل اور نامکمل مسودے ان کی ناگہانی اور بے وقت موت سے تشنۂ طبع رہ گئے۔

ان کے انتقال پر شاہراہ دہلی کے ایڈیٹر پرکاش پنڈت نے ایک "رشید جہاں نمبر" شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چونکہ محمود الظفر ہنوز ملک سے باہر تھے لہٰذا ان کی تصانیف کو فراہم کرنے کی ذمہ داری ۱۹۵۲ء میں میرے سپرد ہوئی۔ نعیم خاں نے جو ہم سب کے مشترک دوست رہے ہیں اس سلسلہ میں بڑی مدد کی۔ مگر بدقسمتی سے "رشید جہاں نمبر" منظرِ عام پر نہ آسکا۔

محمود ماسکو سے واپس آنے پر اپنی گوناگوں مصروفیات اور پھر بیماری میں ایسے مبتلا رہے کہ وہ بھی ان تصانیف کو شائع نہ کرا سکے۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۶ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

www.taemeernews.com

سولہ سال کی طویل مدت کے بعد اب یہ دیرینہ خواہش بیدار ہو کر ہوئی کہ مرحومہ کی غیر مطبوعہ تصانیف کو منظر عام پر لایا جائے۔ پروفیسر آل احمد سرور۔ نعیم خاں اور دوسرے دوستوں کے تعاون سے چودہ مختصر کہانیوں اور ریڈیائی ڈراموں کا انتخاب ہوا جن میں ایک کہانی انگریزی سے ترجمہ ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس انتخاب کی کہانیاں رشید جہاں کے رجحانات اور ان کے عصر کی تحریکوں کی عکاس ہوں۔

ڈاکٹر حمیدہ سعید الظفر

www.taemeernews.com

009
www.taemeernews.com

پ

رشید آپا

ڈاکٹر حمیدہ سعیدالظفر

رشید جہاں جو اپنے سات بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں دہلی میں ۲۵ اگست ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کے والد شیخ عبداللہ مرحوم مسلم گرلس اسکول اور ویمنس کالج علی گڈھ کے بانی تھے۔ ان کی والدہ وحید جہاں[1] بیگم نے جو علی بی۔ کے نام سے مشہور تھیں مدرسہ کی تاسیس میں شیخ عبداللہ کی بڑی مدد کی۔ وہ تعلیم نسواں کی اتنی حامی تھیں کہ جب اسکول بورڈنگ کا مسئلہ اٹھا تو انھوں نے اپنا گھر چھوڑ کر بورڈنگ میں اس خیال سے رہائش اختیار کی کہ اس سے ایک طرف تو ان ماؤں کو اطمینان ہو جن کی لڑکیاں یہاں پڑھنے اور رہنے آئیں اور دوسری طرف وہ خود بورڈنگ کی نگرانی کر سکیں۔ یہ اسکول رشید جہاں کی پیدائش کے ایک سال بعد ۱۹۰۶ء میں قائم ہوا۔ اسی لئے رشید جہاں نے ہنستے ہوئے ایک بار کہا تھا "ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے ہمارا تو تعلیم نسواں کا اوڑھنا ہے اور تعلیم نسواں کا بچھونا ہے"۔

اسلئے کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ رشید جہاں کم عمری ہی سے اپنے ملک و قوم کے سماجی مسائل میں دلچسپی لینے لگیں اور قومی تحریک سے بھی متاثر ہوئیں

---

[1] سوانح عمری عبداللہ بیگم از ڈاکٹر ۔ عبداللہ علی گڈھ ۱۹۵۴ء

www.taemeernews.com

یہی اسباب تھے جن کی بنا پر انھوں نے چودہ ۱۴ سال کی عمر سے ہی صرف سفید کھدر کا لباس پہننا شروع کر دیا اور اس معاملہ میں ان کے والدین نے بھی کبھی مداخلت نہیں کی۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں رشیدہ نے ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد علی گڑھ چھوڑا اور لکھنؤ چلی آئیں۔ جہاں انھوں نے ازابیلا تھوبرن کالج میں انٹرمیڈیٹ سائنس میں داخلہ لیا تاکہ بالآخر ڈاکٹری پڑھ سکیں۔ یہاں وہ ایک پڑھنے لکھنے کی شوقین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کی شرارتی بھی تھیں۔ انھیں بچپن ہی سے ادبیات سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور لکھنے لکھانے کا شوق بھی تھا۔ چنانچہ اٹھارہ سال کی عمر میں جبکہ وہ آئی۔ ٹی کالج میں تھیں انھوں نے معاشرتی موضوع پر ایک کہانی "سمی" کے عنوان سے انگریزی میں لکھی۔ جس کا اردو ترجمہ اس مجموعے میں شامل ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء اور سنہ ۱۹۲۹ء کے درمیان رشیدہ لیڈی ہارڈنگ میڈیکل کالج نئی دہلی کی طالبہ تھیں اس کالج میں انھیں نہ تو کوئی علمی اعزاز ملا، اور نہ ہی کسی درجہ میں ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اسکے باوجود ان کی شخصیت میں کچھ ایسی رعنائی اور دلکشی تھی کہ آج بھی ان کے زمانے کے طلبا اور اساتذہ انھیں یاد کرتے ہیں۔ ان کا حافظہ بہت اچھا تھا اور ذہانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی وہ کالج کی زندگی سے بھرپور حظ اٹھانا جانتی تھیں۔ ان کا رجحان فطری طور پر طب کے عملی اور سماجی پہلو کی طرف زیادہ تھا

www.taemeernews.com

یہ ایک مثال سے واضح ہو جائے گا۔ وہ میڈیکل کالج کے چوتھے سال کی طالبہ تھیں کہ ایک نوجوان لڑکی اسپتال کے شعبۂ امراضِ چشم میں داخل ہوئی دراصل اس کی آنکھوں میں کوئی خرابی نہیں تھی لیکن اس نے اپنی آنکھوں میں کچھ ایسی چیزیں ڈال لی تھیں کہ جن کے سبب اسے اسپتال میں داخل کرلیا گیا تھا۔ جلد ہی وہ اچھی ہو گئی لیکن اس نے اسپتال چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ جب اسے مجبور کیا گیا تھا۔ تو وہ رشیدہ کے پاس (جن کی نرم دلی کی وہ تعریف سن چکی تھی) آئی اور ان سے بتایا کہ وہ کس طرح گھر سے بھاگ کر آئی ہے اور اس کا باپ اسے کس کس طرح دق کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ اس نے طے کر لیا ہے کہ وہ اب یہاں سے کہیں اور چلی جائے گی۔ اس کا مُتا ہوا چہرہ دیکھ کر اور اس کی دردناک کہانی سن کر رشیدہ اتنی متاثر ہوئیں کہ فوراً ہی موٹر کی گاڑی سے اسے لے کر علی گڑھ چلی آئیں۔ یہاں اعلیٰ بی ... نے اسے اپنی نگرانی میں اسکول میں رکھا اور اس کے باپ کی دھمکیوں کے باوجود اسے مفت تعلیم حاصل کرنے کی سہولتیں دیں یہاں تک کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل ہو گئی۔

لیڈی ہارڈنگ کالج کے دورانِ قیام رشیدہ نے ایک ڈرامے کی ہدایت کاری کی، یہ ڈرامہ مقبول ہوا۔ یہاں میڈیکل کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی سرگرمیاں جاری رہیں۔

انھوں نے ۱۹۲۹ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی ان کے ایک رفیق بیان کرتے ہیں کہ وہ دنیاداری سے بہت دور تھیں۔ چنانچہ

012 www.taemeernews.com

ج

ایک بار ایسا ہوا کہ ایک جگہ کے لئے انھوں نے اور ایک اور لڑکی نے درخواست دی۔ لڑکی منتخب کرلی گئی۔ اس واقعہ سے بجائے اس کے کہ رشیدہ کو حسد ہوتا وہ اس لڑکی کے پاس گئیں اور کہا کہ تم سمجھتی ہوگی کہ مجھے اس انتخاب سے رنج ہوا ہوگا۔ لیکن درحقیقت میں بہت خوش ہوں کہ تمھیں ملازمت مل گئی۔ آخر ہم دونوں بہنوں ہی کی طرح تو ہیں۔ بہرحال کچھ ہی دنوں کے بعد وہ یو۔ پی میڈیکل سروس میں آگئیں اور سب سے پہلے کانپور اور اس کے بعد ملند شہر اور لکھنؤ میں تعینات ہوئیں۔

۱۹۳۱ء میں جب وہ لکھنؤ میں تھیں تو ان کی ملاقات سجاد ظہیر احمد علی اور میرے بھائی محمود الظفر سے ہوئی۔ یہ نوجوان اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے اور ملک کے سماجی اور سیاسی حالات کے بارے میں ترقی پسند خیالات کے حامل تھے۔ نومبر ۱۹۳۲ء میں ان تینوں نوجوان ادیبوں اور رشیدہ کے افسانوں کا ایک مجموعہ "انگارے" لکھنؤ سے شائع ہوا۔ ان افسانوں کے انقلابی اور غیر روایتی انداز کا شدید ردِعمل ہوا جس کے نتیجہ میں یہ کتاب حکومت نے ضبط کرلی۔ اس میں رشیدہ کی دو کہانیاں 'دلی کی سیر' اور 'پردے کے پیچھے' شامل ہیں۔ ان کی اشاعت پر رشیدہ کو بہت سے گمنام اور دھمکی آمیز خطوط موصول ہوئے جن کی انھوں نے کوئی پرواہ نہ کی لیکن ساتھ ہی مولانا عبدالحق نے اپنی ایک تنقید میں ان مضامین کو سراہا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب رشیدہ اور محمود الظفر ایک دوسرے کے قریب آئے۔ چنانچہ ان دونوں نے ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو بہرائچ میں جہاں

www.taemeernews.com

رشیدہ تعینات تھیں شادی کرلی۔ اس کے جلد ہی بعد میرے بھائی اپنی دلہن کو دہرہ دون لائے جہاں میرے والد اپنی ملازمت پوری کرکے ریٹائر زندگی گذار رہے تھے۔ میں اسکول جاتی تھی یہاں میرے والدین نے ان کے لئے ایک بڑے استقبالیے کا انتظام کیا۔ اور میں نے پہلی دفعہ ایک غیر روایتی دلہن کو دیکھا جس نے بھڑک دار لباس اور زیورات پہننے سے انکار کر دیا اور اس سے بھی کہ انھیں "دلہن بیگم" یا بھابی جان سے مخاطب کیا جائے۔ بلکہ وہ چاہتی تھیں کہ میرے والدین انھیں رشیدہ کہیں اور میں انھیں رشیدہ آپا کہوں۔ میری والدہ ان باتوں سے خاصی متحیر ہوئیں لیکن میرے والد نے ان بدلتی ہوئی روایات سے مناسب سمجھوتا کیا جس کا نتیجہ بہرحال بہتر ہی ہوا۔

شادی کے وقت محمود امرتسر کے ایم۔ اے۔ او کالج میں وائس پرنسپل تھے اسلئے رشیدہ نے صوبائی میڈیکل سروس سے استعفےٰ دیدیا۔ اور امرتسر چلی آئیں۔ یہیں انھوں نے پہلی بار پرائیوٹ پریکٹس شروع کی۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں دونوں نے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی کانفرنس[۱] میں جو لکھنؤ میں ہوئی تھی شرکت کی۔ اس کانفرنس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی۔ یہاں جب رشیدہ کی ملاقات منشی پریم چند سے ہوئی تو وہ انکی شخصیت سے گہرے طور پر متاثر ہوئیں۔ انھوں نے اردو میں بہت سی کہانیاں لکھیں ان میں نو کہانیاں "عورت" اور "دیگر افسانے" کے نام سے لاہور سے سنہ ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئیں۔ اس سال انھوں نے یورپ اور

---

۱ روشنائی از سجاد ظہیر۔ مکتبہ اردو۔ لاہور سنہ ۱۹۵۶ء

014 www.taemeernews.com

انگلستان کا سفر کیا۔ محمود بھی ساتھ تھے۔ ان دنوں رشیدہ کے گلے کے غدود بڑھ گئے تھے۔ جس سے وہ بہت دبلی ہو گئی تھیں۔ اس سفر کا مقصد یہی تھا کہ یورپ میں ان کا معقول علاج ہو جائے۔ نومبر ۱۹۳۷ء میں یہ لوگ یورپ سے واپس لوٹے۔ محمود نے امرتسر میں ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور طے کیا کہ اب وہ مکمل طور پر سیاسی کاموں میں حصہ لیں گے۔ رشیدہ بھی امرتسر سے دہرہ دون چلی آئیں۔ یہاں ہمارے گھر "نسرین" کا ماحول خاصا روایتی تھا۔ چنانچہ رشیدہ کا زیادہ وقت باہر گزرتا تھا لیکن ان پر اسکے لئے کبھی زور نہیں دیا گیا کہ وہ گھر کے معمولات کی پابندی کریں۔ اکثر میری والدہ جب ان سے پوچھتیں کہ وہ دوپہر رات کو کھانے کے وقت آجائیں تو رشیدہ یہی کہتیں کہ "اماں جان میں وقت کی قیدی نہیں بن سکتی۔ آپ میرا انتظار نہ کیجئے گا"۔ میری والدہ جلد ہی ان کی خوبیوں سے واقف ہو گئیں اور رفتہ رفتہ وہ ان کو بہت چاہنے لگیں۔ رشیدہ کو ایک چیز کی بہت پابندی تھی اور وہ تھی صبح کی چائے۔ اسلئے کہ وہ رات گئے اور اکثر تین چار بجے صبح تک کام کرتی رہتیں۔ کبھی کبھی وہ مجھے چپکے سے اپنے کمرہ میں بلا لیتیں اور دیر تک اپنی لکھی ہوئی کہانیاں سناتی رہتیں۔ میں ایسے موقعوں پر کافی لطف اندوز ہوتی۔ یہی زمانہ تھا جب ہم میں دوستانہ روابط کی ابتدا ہوئی اور پھر تو یہ حال ہو گیا کہ ہمیں ایک دوسرے کے بغیر چین نہ پڑتا تھا وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ "میں تمھیں نند نہیں اپنی بہن سمجھتی ہوں" اور میں بھی انھیں اتنا ہی عزیز سمجھتی تھی ۱۹۳۸ء اور ۱۹۴۲ء کے درمیان رشیدہ نے بہت سی کہانیاں۔ ڈرامے اور مضامین لکھے ان میں سے چند رسالہ "نیا ادب" میں اور اس

015 www.taemeernews.com

خ

زمانہ کے دوسرے رسالوں میں شائع ہوئے لیکن زیادہ تر مسودے کی شکل میں پڑے رہے۔

۱۹۴۲ء میں رشیدہ لکھنؤ چلی آئیں میں اس زمانہ میں لکھنؤ میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی اور ہاسٹل میں رہتی تھی۔ رشیدہ نے وہاں امراضِ نسواں کے ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنی پریکٹس شروع کی۔ وہ جلد ہی وہاں مقبول ہو گئیں انھوں نے چند دنوں لکھنؤ میڈیکل کالج میں امراضِ نسواں کے لکچرر کی حیثیت سے بھی کام کیا تھا۔ ۱۹۴۲ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیان وہ اکثر بیمار رہتی تھیں اور اسی دوران انکے تین بڑے آپریشن بھی ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود وہ جانفشانی سے اپنے کام میں لگی رہتیں اور کبھی حرفِ شکایت انکی زبان پر نہ آیا۔ انہوں اپنی ذاتی منفعت کے بارے میں کبھی نہ سوچتی تھیں اور برابر دوسروں کی بھلائی اور خدمت میں لگی رہتی تھیں (طبی اور سماجی بہبود کے مشاغل بھی جاں کو لگے رہے) لیکن انھوں نے اس دوران بھی قلم کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور بہت سی کہانیاں اور ڈرامے لکھے جن میں بیشتر لکھنؤ اور دہلی ریڈیو سے نشر بھی ہوئے۔ ان ڈراموں میں سے بعض کی ہدایت کاری بھی رشیدہ نے خود کی تھی۔ انھوں نے لکھنؤ میں ایک ایسا تربیتی مرکز بھی کھولا تھا جس میں ان لوگوں کا داخلہ ہوتا جنھیں سرکاری اسپتال میں طبی سہولتیں نہ ملتیں یا جن کی اپنے گھروں میں بھی اچھی دیکھ بھال نہ ہو سکتی تھی۔ اس کام میں انھیں اپنے ڈاکٹر دوستوں کا مفت تعاون حاصل تھا۔ ان میں میڈیسن بچوں کے امراض اور دیگر ماہرین شامل تھے انھیں مختلف المزاج لوگوں سے کام لینے کا

www.taemeernews.com

ڈھنگ آتا تھا۔ ان میں طبقاتی احساس ذرا بھی نہیں تھا وہ اپنے گھر کے نوکروں کو خاندان کا فرد سمجھتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ ہر وقت انکے حکم پر ان کا کام کرنے کے لئے تیار رہتے۔ وہ طبیعت کی غنی تھیں۔ فیاضی اور ایثار اسقدر تھا کہ احساس ملکیت ختم ہو گیا تھا۔ وہ ساز و سامان کی افراط کو پسند نہ کرتی تھیں اور اپنی چیزیں لوگوں کو بانٹتی رہتی تھیں۔ لکھنؤ میں ان کا گھر ان کے عزیزوں۔ دوستوں اور دوسرے لوگوں کے لئے ہر وقت کھلا رہتا اور وہ انکی مشکلات اور دشواریوں کو دور کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتیں۔ محمود بنیادی طور پر نظم و ضبط کو پسند کرتے تھے لہٰذا گھر میں کچھ توازن انھیں کی وجہ سے برقرار رہتا۔ طبیعتوں کے یک گونہ تضاد کے باوجود انھیں اپنے اپنے کاموں میں ایک دوسرے سے بڑا تعاون ملتا۔ اور ان کی گھریلو اور سماجی زندگی میں ایک ہم آہنگی برقرار رہتی۔ رشیدہ شب و روز کام میں لگی رہتی تھیں۔ لیکن اس لحاظ سے ان کی آمدنی زیادہ نہ تھی۔ وہ اتنی ہی رقم کافی سمجھتی تھیں جس سے ان کے گھر کا خرچ اور دواخانہ چلتا رہے۔

۱۹۵۱ء کی گرمیوں میں یہ معلوم ہوا کہ انھیں سرطان ہے۔ انکا ٹاٹا میموریل اسپتال میں ڈاکٹر بارجس نے آپریشن کیا۔ لیکن بدقسمتی سے مرض کا مکمل طور پر ازالہ نہ ہو سکا اور آٹھ مہینے کے بعد یہ دوبارہ ابھرا۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں وہ پھر بمبئی گئیں۔ وہاں ڈاکٹر بارجس نے بتایا کہ مرض بہت بڑھ چکا ہے اور اب اس کا علاج ان کے اختیار سے باہر ہے۔ ڈاکٹر بالیگا نے محمود کو مشورہ دیا کہ وہ انھیں ماسکو لے جائیں کہ وہاں اس مرض کے علاج کے کچھ نئے طریقے

www.taemeernews.com

دریافت ہوئے ہیں۔ وہ اپنی نازک حالت سے اچھی طرح واقف تھیں اور کمزوری اتنی بڑھ چکی تھی کہ ایسی حالت میں سفر نہایت دشوار تھا اور سرطان کا زہر برابر ان کے پیٹ میں سرایت کر رہا تھا۔ وہ بجائے اپنے بارہ میں غمزدہ ہونے کے دوسروں کے لئے فکرمند تھیں اور اسلئے وہ ماسکو جانے کے لئے راضی بھی ہوئیں کہ انھوں نے خود ہی کہا کہ اس طرح محمود کو روس دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ میں یہ بات اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرا مرض لاعلاج ہو چکا ہے اور اس سلسلے میں روسی ڈاکٹر بھی کچھ نہیں کر سکتے لیکن میں چاہتی ہوں کہ محمود کو میرے علاج کے سلسلے میں کوئی حسرت باقی نہ رہ جائے اور وہاں جانے سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ میرے جسم پر روسی ڈاکٹروں کو تجربہ کرنے کا موقع ملے گا ممکن ہے اس سے کوئی نئی بات معلوم ہو اور انسانیت کو فائدہ پہونچے۔ ماسکو جانے سے پہلے انھوں نے بمبئی میں مجھ سے کئی بار کہا کہ " مجھے سب سے زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ میں تمھیں یہاں اکیلا چھوڑ کر جارہی ہوں۔"

میرے والدین کے انتقال کے بعد ان کا برتاؤ میرے ساتھ ہمیشہ مہربانہ اور مشفقانہ رہا۔ بہرحال انھوں نے اپنی قوتِ ارادی اور بے پناہ جرأت سے سفر کا آغاز کیا۔ اس زمانہ میں ماسکو تین دن میں پہونچتے تھے اور راستہ میں دو جگہ ہوائی جہاز بدلنا پڑتا تھا۔ لیکن ان تکلیفوں کو انھوں نے صرف اس لئے برداشت کیا کہ محمود اس بہانہ روس دیکھ لیں گے اور ممکن ہے کہ میڈیکل سائنس میں ان کے جسم پر تجربہ سے کوئی نیا اضافہ ہو۔ حالانکہ وہ بخوبی جانتی تھیں کہ مرض لاعلاج ہے اور بہت دیر ہو چکی ہے۔ روسی ڈاکٹر

018 www.taemeernews.com

بھی یہی کرسکے کہ انھیں جتنا آرام پہونچا سکیں پہونچا دیں۔ روس پہونچنے کے تقریباً تین ہفتہ کے اندر سینتالیس۴۷ سال کی عمر میں ۲۹ جولائی ۱۹۵۲ء کو وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اور ان کی آخری آرام گاہ ماسکو کا ویڈنسکی گورستان بنا۔ ان کے انتقال کے چند مہینے بعد محمود اکیلے حسرت و غم کو لئے ہوئے ہندوستان لوٹ آئے۔[۱]

---

[1]: Ref Quest for Life :- Dr S. Mahmooduzzafar
Peoples Publishing House Bombay
1954

019 www.taemeernews.com

رشید جہاں

ایک تاثر

۲۹ جولائی ۱۹۵۲ء کو ڈاکٹر رشید جہاں کا ماسکو میں انتقال ہوگیا یہ خبر ان کے کثیر احباب، قدر دانوں، ملنے والوں اور رفقائے کار کے لئے بڑے دکھ اور صدمے کا باعث ہے۔ زندگی کا جو شعلہ اس بہادر مستقل مزاج دلیر اور دلکش شخصیت میں موجزن تھا اُسے سرطان کے موذی مرض نے بالآخر بجھا ہی دیا۔ دو سال ہوئے اس جان لیوا مرض کا شکار ہوئیں۔ بمبئی میں آپریشن ہوا اور یہ امید بندھی کہ مرض پر قابو پالیا گیا ہے مگر ان کی صحت برابر گرتی گئی۔ انھوں نے لکھنؤ میں سکونت ترک کرکے دہرہ دون میں قیام کرلیا تھا۔ ہر ممکن علاج کے بعد جب بمبئی کے ڈاکٹروں نے جواب دیدیا تو اُنکے شوہر محمود الظفر ان کو ماسکو لے گئے۔ خیال یہ تھا کہ چونکہ سرطان کا علاج وہاں بہت ترقی کرچکا ہے اس لئے ماسکو کے ڈاکٹر مرض کی رفتار کو روکنے میں کامیاب ہوجائیں گے مگر وہ بالکل آخری وقت میں وہاں پہونچ سکیں اور ۲۴ دن مختصر قیام کے بعد اس دنیا سے چل بسیں۔

رشید جہاں کا خیال آتا ہے تو کتنی ہی یادیں تصویریں بن کر ذہن میں ایک ہلچل بپا کردیتی ہیں وہ ایک ذہین، فرض شناس اور قابل لیڈی ڈاکٹر تھیں وہ ایک بے نظیر سیاسی کارکن تھیں وہ ایک قابل قدر افسانہ نگار تھیں وہ بزم

www.taemeernews.com

میں سورج کی کرن اور پھولوں کی خوشبو تھیں وہ رزم میں ایک ایسی تلوار تھیں جس کا وار کبھی خالی نہ جائے جن لوگوں سے وہ محبت کرتی تھیں انھیں اس محبت کے مقابلے میں ہر چیز ہیچ معلوم ہوتی تھی، وہ جن سے نفرت کرتی تھیں انھیں بخشنے کے لئے تیار نہ تھیں۔ اُن میں عورت کا جلال و جمال دونوں گھل مل گئے تھے۔ وہ زندگی کی ہر لڑائی میں مردوں کے دوش بدوش مجاہدانہ عزم کے ساتھ شریک ہوتی تھیں۔ وہ مرعوب ہونا جانتی ہی نہ تھیں وہ تھک جاتی تھیں مگر بددل نہ ہوتی تھیں وہ جلد خفا ہو جاتی تھیں مگر اس سے جلد من جاتی تھیں۔ وہ ایک پختہ عقیدہ اور اٹل عزم رکھتی تھیں اور زندگی کی سینکڑوں آزمائشوں سے ہنستے کھیلتے گزر جانا جانتی تھیں ان کے شوہر عرصہ تک اپنے سیاسی عقائد کی وجہ سے روپوش رہے خود انھیں قید و بند کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔ اپنی بیماری دوستوں اور عزیزوں کے مصائب نے انھیں بدحواس اور پریشان کر دیا مگر ان کی فطری شگفتگی زندگی پر ایک اٹل یقین اور ایک بہتر سماجی نظام کی آرزو کبھی ماند نہ ہوئی۔

ڈاکٹری کا پیشہ بڑا ظالم پیشہ ہے ڈاکٹر زندگی اور موت سے اس طرح کھیلتا ہے کہ وہ بالعموم بے حس اور بے رحم ہو جاتا ہے۔ مریض اس کے لئے ایک قابل رحم انسان کی طرح نہیں ہوتا ایک کیس ہوتا ہے جس سے روپیہ ملنے کی امید ہوتی ہے۔ رشید جہاں کبھی اس قسم کی ڈاکٹر نہ بن سکیں۔ اول تو ڈاکٹری ان کے لئے منزلِ مقصود نہ تھی۔ یہ کبھی ان کی ساری زندگی بھی نہ بن سکی، زندگی کا ایک شعبہ ہی رہی۔ ڈاکٹر اپنی پریکٹس جمانے کے لئے آجکل جو جتن کرتے ہیں، وہ رشید جہاں کو نہ آتے تھے۔ پھر اُن کی سیاسی اور ادبی مصروفیات انھیں اس

021 www.taemeernews.com

کام پر پوری توجہ بھی نہیں دینے دیتی تھیں۔ میں نے اکثر دیکھا کہ اُن کی نرس اُن کی ناصح مشفق بن جاتی تھی اور اُنھیں پریکٹس کے گُر بتاتی تھی مگر اُن پر ذرا بھی اثر نہیں ہوتا تھا۔ پھر ادب سے انھیں دلچسپی ہی نہ تھی عشق بھی تھا مجھ سے بارہا انھوں نے کہا کہ وہ اپنا کام چھوڑ کر سارا وقت افسانے لکھنے میں گزارنا چاہتی ہیں۔ میں نے انھیں اس ارادے سے ہمیشہ باز رکھنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹری اور تصنیف اور تالیف ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں وہ بہت اچھی لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ انھوں نے بعض ایسے مشکل اور نازک آپریشن کئے ہیں۔ ایسے ایسے لاعلاج مریض اچھے کئے ہیں، غریب مریضوں کی ایسی مدد کی ہے کہ اسکی مثالیں کم ملتی ہیں مگر وہ چونکہ ظاہری رکھ رکھاؤ اور اوپری اخلاق سے ناواقف تھیں اس لئے نالائق تیمارداروں کی اس طرح خبر لیتی تھیں اور پیسے سے جو ڈاکٹروں کو خریدنا چاہتے ہیں اُن کو ایسی کھری کھری سناتی تھیں کہ لوگ اُن سے خفا ہو جاتے تھے۔ وہ علاج کے علاوہ بھی مریض سے ایک ذاتی تعلق قائم کر لیتی تھیں اُس کے دکھ درد کی ساتھی بن جاتی تھیں۔ اُن کے دل میں بڑی جگہ تھی۔ بعض مریضوں کے لئے وہ اپنے دوستوں سے چندہ بھی کر لیتی تھیں۔ وہ اُمرا میں کبھی مقبول نہیں ہوئیں۔ اُن کے ناز و نخرے کبھی اُن سے برداشت نہیں ہوئے۔ لیکن متوسط طبقہ اور عوام کے لئے وہ ایک فرشتۂ رحمت تھیں۔ اُن کے ہم عصر ڈاکٹر کہا کرتے تھے کہ تم نے کبھی جم کر پریکٹس نہیں کی پھر نہ معلوم کیوں جب تم مطلب میں بیٹھنے لگتی ہو تو مریض بھی لوٹنے لگتے ہیں۔ اس میں تعجب کی کیا بات تھی شمع جب روشن ہوتی ہے تو پروانوں کے لئے اس کے سوا

022 www.taemeernews.com

چارہ کار ہی کیا ہے کہ اُس کے گرد جمع ہو جائیں۔

رشید جہاں ایک راسخ العقیدہ اور پُر جوش کمیونسٹ تھیں وہ اپنے خیالات کے اظہار سے کبھی اور کسی حال میں باز نہیں آتی تھیں۔ وہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتی تھیں۔ انھیں ایک رنگ محبوب تھا وہ تھا سرخ رنگ، وہ اُن کمیونسٹوں میں سے نہ تھیں جو ڈرائنگ روم یا کافی ہاؤس میں بیٹھ کر دنیا کو بدلنے کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ وہ دنیا کو بدلنے میں مصروف تھیں انھوں نے اپنے عقائد کے لئے تکلیف اٹھائی تھی، مشکلات جھیلی تھیں۔ پریشانیوں اور دشواریوں کے ایک لامتناہی سلسلے سے گزری تھیں انھوں نے مارکس اور دوسرے اساتذہ کا مطالعہ کیا تھا اپنے فن کے علاوہ دوسرے علوم کے مبادیات کا بھی انھیں علم تھا وہ گہری نظر کی مالک تو نہ تھیں مگر ایک واضح اور مرتب ذہن ضرور رکھتی تھیں وہ شہر کی اُن تمام تحریکوں میں شریک ہوتی تھیں جو موجودہ سماجی نظام کو بدلنے اور ہندوستان میں ایک عوامی حکومت قائم کرنے میں مدد دے سکیں۔ اس کے لئے انھیں اپنے آرام، پیسے یا وقت کا کبھی خیال نہ آیا۔ اُن کا گھر ہمیشہ بھرا رہتا تھا کوئی علاج کے سلسلے میں آیا ہے کوئی اپنا افسانہ یا نظم سنانے، کوئی مزدوروں کی تحریک کا کارکن ہے، کوئی لڑکی ان سے گھر کے مسائل میں مشورہ لینے آئی ہے، کوئی لڑکا سیاسی مسائل پر تبادلۂ خیالات کرنے۔

محمود اکثر ان لڑکیوں کا نام لے کر ہنسا کرتے تھے جنھیں رشید جہاں نے قریب قریب متبنیٰ کر لیا تھا اور پھر اُن کی تعلیم، قیام، محبت، زندگی کے مشاغل سب کی نگراں ہو جاتی تھیں۔ اُن کا دل بڑا وسیع تھا ان کا دروازہ

023 www.taemeernews.com

ص

بھی سب کے لئے کھلا ہوا تھا۔ ان کے یہاں شاعر و ادیب۔ کمیونسٹ۔ سرکاری افسر۔ امیر غریب سب آتے تھے وہ سب سے ایک ہی طرح پیش آتی تھیں، ایسے کتنے ہی لوگوں کو میں جانتا ہوں جو سیاسی عقائد میں اختلاف رکھتے ہوئے بھی ان کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان رہے۔ ایک دفعہ شہر کے دو ممتاز ڈاکٹروں میں اختلاف ہوگیا ان تمام احباب کو جو دونوں کو اپنی اپنی جگہ عزیز رکھتے تھے اس کا افسوس تھا مگر کوئی دونوں کو یکجا نہیں کر سکتا تھا یہ مہم بالآخر رشید جہاں ہی نے سر کی۔

رشید جہاں شروع سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تحریک سے وابستہ رہیں۔ سب سے پہلے جب ۱۹۳۲ء میں "انگارے" شائع ہوئی تو سجاد ظہیر، احمد علی۔ محمود الظفر کے علاوہ اس میں رشید جہاں کے بھی افسانے تھے۔ ان افسانوں میں انھوں نے اپنی عملی واقفیت اور تجربے سے کام لیکر ہماری معاشرت کی خرابیوں کو واضح کیا تھا اور زمانے میں ان پر بڑی لے دے ہوئی لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان میں کسی قسم کی عریانی یا لذیت نہ تھی۔ ہاں جو سطح بین حقیقت نگاری کو عریانی یا ابتذال کا نام دے دیا کرتے تھے ان کے لئے بہت کچھ سامان تھا۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "عورت" کے نام سے شائع ہوا اور "دنیا ادب" میں کئی افسانے اور ڈرامے نکلے ان میں "آصف جہاں کی بہو" ایک قابل قدر کارنامہ ہے۔ رشید جہاں کو سیاست اور ڈاکٹری نے اتنی فرصت نہ دی کہ وہ ان افسانوں اور ڈراموں کو یکجا کر کے شائع کر دیتیں۔ میں نے دو مضمونوں کے مسودے ان کے پاس دیکھے ہیں اور یقین ہے کہ ان کی اشاعت سے ہمارے

024 www.taemeernews.com

ض

افسانوی ادب میں صحت ذہنی اور حقیقت نگاری کا رجحان ترقی کرے گا۔ انھوں نے ریڈیو پر بھی پریم چند اور دوسرے افسانہ نگاروں کے کارناموں کو ڈرامائی روپ میں پیش کیا تھا انھیں کام کرنا بھی آتا تھا اور دوسروں سے کام لینا بھی۔ جب دسمبر ۱۹۴۷ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے آل انڈیا اردو کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی تو رشید جہاں نے سب کام چھوڑ کر اس کے لئے چندہ جمع کیا اور ایسے انہماک اور تندہی سے کانفرنس میں کام کیا کہ حیرت ہوتی تھی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین اور انڈین پیپلز تھیٹر کی وہ روح رواں تھیں انجمن کے جلسوں میں وہ اکثر اپنے دوسرے کاموں کا ہرج کرکے شریک ہوتی تھیں مقالوں، افسانوں۔ اور نظموں پر بحث میں وہ بڑے جوش اور انہماک سے حصہ لیتی تھیں۔ جب لائسنکو کے تجربات کا یہاں چرچا ہوا تو انجمن میں اس کے نظریات و تجربات پر رشید جہاں نے ایک بڑا سلجھا ہوا مقالہ پڑھا تھا انھیں علمی مسائل کو عام فہم انداز میں بیان کرنے کا ڈھب آتا تھا۔ اچھے شاعروں اور ادیبوں سے انھیں بڑی گہری محبت تھی۔ وہ ان کے ساتھ اس احترام و خلوص سے پیش آتی تھیں، ان کے ناز نخرے اس طرح برداشت کرتی تھیں، ان کی خدمت پر اس طرح تیار رہتی تھیں اور ان کی ذرا سی کوتاہی پر اس طرح محبت آمیز فہمائش کرتی تھیں کہ وہ ان سے اور بھی محبت کرنے لگتے تھے۔ میں نے جوش کو رندی میں رشید جہاں کے سامنے ہوشیار اور با ادب پایا ہے اور جگر کی زبان سے بارہا ان کی تعریف سنی ہے۔ مذہب، ملت اور ذات پات سے بلند اس پیکر مہر و وفا کے لئے میں نے مذہب کے اماموں اور دہریت کے

www.taemeernews.com

ط

پرستاروں کو متفقہ طور پر ثنا خواں پایا جو ان سے سخت اختلاف رکھتے تھے وہ ان کے احترام پر مجبور ہوتے تھے۔

رشید جہاں شیخ عبداللہ بانی مسلم کالج علی گڈھ کی سب سے بڑی لڑکی تھیں۔ شیخ عبداللہ سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں اور انھوں نے مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا مشن قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان خواتین میں جو نئی زندگی آئی ہے اور بیداری رونما ہو رہی ہے اس کا سب سے بڑا محرک یہ کالج ہے۔ رشید جہاں نے اس کالج میں تعلیم ختم کرنے کے بعد ایم بی بی ایس کیا۔ کچھ دنوں اپنے شوہر محمود الظفر کے ساتھ امرتسر اور لاہور میں رہیں پھر لکھنؤ چلی آئیں۔ لکھنؤ میں ان کی عملی زندگی کا بیشتر حصہ گذرا۔ یہیں انھوں نے زندگی کی بہت سی لڑائیاں لڑیں۔ موت کے وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ ۴۶-۴۷ سال کی ہوگی۔ وہ ایک اور رنج و راحت۔ سختی و سستی کے مراحل سے گذریں۔ دراز قد، موزوں اور متناسب جسم رکھتی تھیں۔ سرخ و سفید رنگ۔ ان کی شخصیت کی دل آویزی اور دل کشی، ان کے لہجے کی ایک خاص کھنک اور ان کے تبسم کی بے مثال چاندنی ان کے احباب اور ساتھی بھلائے نہیں بھول سکتے۔

حالانکہ میں انھیں بہت عرصہ سے جانتا تھا اور وہ بھی شاید مجھ سے ناواقف نہ تھیں مگر پہلی ملاقات ۱۹۴۶ء میں ہوئی۔ مجنوں گورکھپور سے آئے تھے ______

رشید جہاں سے ملنے جا رہے تھے اصرار کر کے مجھے بھی لے گئے۔ رشید جہاں سخت نزلہ میں مبتلا تھیں۔ بستر پر دراز تھیں مگر کمرے میں بہت سے آدمی تھے پہلی ہی

www.taemeernews.com

ملاقات میں ان کے خلوص، محبت اور بے ریائی کا قائل ہو گیا۔ مجنوں کو جو لوگ جانتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ وہ کسی سے مرعوب ہونا نہیں جانتے نہ جلد کسی کو خاطر میں لاتے ہیں۔ رشید جہاں اسی طرح ان کی خبر لے رہی تھیں جیسے ایک بڑی بہن ایک چھوٹے بھائی پر برسے اور مجنوں ایسی نظروں سے انھیں دیکھ رہے تھے جن میں ممنونیت بھی تھی، احترام بھی تھا اور محبت بھی تھی۔ مجھ سے تھوڑی دیر باتیں ہوئیں مگر ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں اور جانتے ہی نہیں بلکہ ذہنی قربت بھی رکھتے ہیں۔ رشید جہاں میں ایک جادو تھا اور وہ جادو خلوص کا تھا۔ پھر تو بار بار ملاقات ہوئی، جب طبیعت گھبراتی یا کوئی کام نہ ہوتا تھا تو محمود الظفر اور رشید جہاں سے ملنے چلا جاتا تھا۔ محمود کی سنجیدہ، خیال انگیز، نستعلیق اور شستہ گفتگو اور رشید جہاں کے پُرجوش، پُرتپاک اور دل آویز انداز خطاب سے ہمیشہ تسکین و تازگی ملی۔ جو لوگ رشید جہاں سے ذرا بھی قریب رہے ہیں وہ اس متحرک، پُرجوش، بیباک اور پیکر سیماب کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے نہ وہ اس بے پناہ عزم و استقلال، اس ذوقِ یقین اور اس سوزِ آرزو کو بھلا سکتے ہیں جو رشید جہاں کی شخصیت میں بڑی آب و تاب سے جلوہ گر تھا۔ رشید جہاں کی سادی زندگی بقول اقبال درد و داغ و سوز و ساز و آرزو کی داستان ہے اندھیرے میں روشنی کی تلاش کی کہانی ہے۔ انھوں نے اس روشنی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور آج دنیا کا بیشتر سرمایہ جنگ کی تیاریوں میں صرف ہو رہا ہے اگر اس کا مختصر سا حصہ بھی بیماریوں اور خصوصاً سرطان اور دق کے

www.taemeernews.com

ع

خلاف جنگ میں صرف ہوتا تو شاید رشید جہاں اور ان جیسی کتنی ہی قابل قدر ہستیوں کو زندگی، علم و عمل اور حسن و محبت میں سے بھرپور حصہ ملتا۔ اور اُن کا رشتۂ حیات اتنی جلد منقطع نہ ہوتا۔

مجھے اس وقت بے ساختہ ایلیا اہرن برگ کے ناول "اسٹارم" (Storm) کا وہ کردار یاد آتا ہے جس نے دوسری جنگ عظیم میں جب بربریت اور انسانیت کے درمیان زندگی اور موت کی جنگ ہو رہی تھی تو مرتے وقت اپنے دوستوں سے کہا تھا "جب روشنی کے دن آئیں تو اتنا یاد کر لینا کہ ہم نے بھی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اُجالے سے محبت کی تھی"۔ رشید جہاں بھی ایسا ہی ایک کردار ہے۔ اس جیالی عورت، زندگی کی اس مجاہدہ اور اُجالے کی اس پرستار کی یاد ہمارے لئے گرمی و روشنی کا ایک پیام ہے جسے وقت کا دھندلکا بھی مدھم نہیں کر سکتا۔

(پروفیسر) آل احمد سرور

قومی آواز
۱۵ راگست ۱۹۵۲ء

---

www.taemeernews.com

یادیں

بات ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء کی ہے۔ یورپ میں جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے۔ جرمن فاسسٹ وا اپنے پورے شباب پر تھا۔ کانگریس ترکِ موالات کی تحریک شروع کرنے کی پس و پیش میں تھی۔ اُن دِنوں کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی۔

رشیدہ آپا و محمود اظفر اُن دنوں دہرہ دون میں ہی رہتے تھے یہ سب جانتے تھے کہ یہ لوگ کمیونسٹ پارٹی کے ممبر ہیں اور پوشیدہ طور پر پارٹی کا کام کرتے ہیں۔ اور پارٹی کی تنظیم کرتے ہیں۔ اُس زمانہ میں دہرہ دون انقلابیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے یو۔پی اور مرکزی سرکاروں کا دھیان دہرہ دون کی طرف زیادہ تھا۔ ہر گلی و کوچہ میں سی۔ آئی۔ ڈی نے اپنے اڈے بنا رکھے تھے۔

میں اُس زمانہ میں چنگاری کی کتابت کیا کرتا تھا کہ مجھے رشیدہ آپا کا پیغام ملا کہ میں سہارنپور سے دہرہ دون آجاؤں۔ میں دہرہ دون پہونچا اور رشیدہ آپا و کامریڈ محمود سے ملا۔

میری عمر اُسوقت ۱۹۔۲۰ سال تھی میرے لئے یہ ماحول بالکل نیا تھا

www.taemeernews.com

ق

میری ملاقات رشیدہ آپا سے اُن کے دواخانے میں ہوئی۔ اُس وقت وہ کچھ لکھ رہی تھیں۔ انھوں نے کہا کہئے! میں نے اپنا نام بتلایا کہ میں نعیم ہوں اور سہارنپور سے.....

ابھی میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ کمرے کا ماحول بدل گیا۔ اُنھوں نے بالکل اسطرح کہ جیسے برسوں کی جان پہچان ہے سوالات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ کب آئے ہو۔ کہاں ٹھہرے ہو، کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔ آنے میں اتنی دیر کیوں لگادی۔ سامان کہاں ہے، فوراً اپنا سامان لے آؤ، تمھارے رہنے کے لئے مکان کا انتظام ہوگیا ہے۔ یعنی جواب کا انتظار کئے بغیر وہ سوال پر سوال کرتی گئیں۔ اس پہلی ملاقات نے میری زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بڑے گھرانوں کی اور پڑھی لکھی عورتیں اپنے ساتھ پارٹی میں کام کرنے والے چھوٹے اور نئے ساتھیوں کے ساتھ کس محبت اور اخلاق سے پیش آتی ہیں۔

اُس دن سے میں ڈاکٹر رشید جہاں کو رشیدہ آپا کہنے لگا۔ اور یہ رشتہ آخیر دم تک قائم رہا۔

میں جنگاری کا پورا انتظامی کام دیکھتا تھا اور رشیدہ آپا اُسکی ادارت کرتی تھیں اور اس جنگاری کی وجہ سے ہی اکثر ہمیں گھنٹوں ایک ساتھ بیٹھ کر کام کرنا پڑتا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ میں اُنکے ساتھ اُنکے گھر بھی چلا جاتا تھا۔

کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی تو تھی ہی۔ اگست ۱۹۴۲ء میں پورے ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کے بڑے لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ کامریڈ محمود بھی گرفتار ہو گئے۔ قریب ایک ہفتہ کے بعد معلوم ہوا کہ میرے نام بھی وارنٹ ہے اور جلدی ہی گرفتار

www.taemeernews.com

ہوجاؤں گا۔ جیسے ہی یہ خبر ملی انھوں نے دہرہ دون سے باہر روپوش طریقہ سے مجھے پہونچانے کا انتظام کردیا۔ ایک روز رات کو مجھے اپنے محفوظ مقام پر پہونچا دیا۔ وہاں میرا کام پارٹی کے کام سے ادھر اُدھر جانا تھا اس درمیان رشیدہ آپا سے برابر ہدایتیں ملتی رہتی تھیں۔

اُن کی ہدایت کے مطابق میں کئی دفعہ دیولی کیمپ سے بھی خبریں لایا۔ دیولی جیل میں نظربندوں نے جو بھوک ہڑتال کی تھی اُس کی خبر پہلی بار رشیدہ آپا نے ہی اخباروں کو دی۔

جنوری ۱۹۴۲ء میں رشیدہ آپا دہرہ دون سے لکھنؤ آگئیں اور بشیشر ناتھ روڈ کا مکان کرایہ پر لے کر پریکٹس شروع کردی۔

اس دوران میرا وارنٹ بھی منسوخ ہوگیا اور میں بھی لکھنؤ آکر اُنکے ساتھ رہنے لگا۔ اسی مکان سے سیاسی و ادبی کام بہت زوروشور سے شروع ہوگئے۔ پارٹی میٹنگوں کے علاوہ پی۔ ڈبلیو۔ اے۔ آئی۔ پی۔ ٹی۔ اے و مشاعرے اکثر ہوتے رہتے تھے۔

اپنی ڈاکٹری کے علاوہ وہ ان کاموں میں اپنا باقی وقت صرف کرتی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ تکان کا نام جانتی بھی نہیں ہیں۔ ان تحریکوں میں جو لوگ اُن کے قریب آئے وہ سب کمیونسٹ پارٹی کے ممبر یا ہمدرد ضرور ہوگئے۔

جنگ کے دوران ہی بنگال میں جو قحط پڑا اُس میں اُنھوں نے دن رات کام کیا اور روپیہ۔ کپڑا۔ دوائیں وغیرہ اکٹھا کرکے بنگال بھیجیں جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ انسانیت سے کتنی محبت کرتی تھیں۔

www.taemeernews.com

اِسی دوران پارٹی کو پیسہ کی ضرورت ہوئی کہیں سے روپیہ کا انتظام نہیں ہو سکا، تو کامریڈ محمود اور اُنھوں نے مشورہ کرکے اپنا پورا زیور پارٹی کو دیدیا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ پارٹی کو روپیہ کی پھر ضرورت ہوئی تو کامریڈ محمود کے والد سے اپنا مہر کا روپیہ مانگا اور وہ روپیہ بھی پارٹی کو دیدیا — اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھیں پارٹی سے کتنی محبت تھی اور پارٹی کے لئے وہ اپنی ہر چیز قربان کرسکتی تھیں۔

آزادی کے بعد کانگریس سرکار نے پورے ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کو قریب قریب غیر قانونی بنادیا تھا جس کی وجہ سے یو.پی کی پوری پارٹی انڈرگراؤنڈ ہو گئی۔ میں اور کامریڈ محمود بھی انڈرگراؤنڈ ہوگئے۔ اور وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ جیل میں بند کردی گئیں۔ وہاں انھوں نے بھوک ہڑتال کی۔ سرکار کو مجبور ہوکر انھیں رہا کرنا پڑا۔

اس انڈرگراؤنڈ زمانے میں پوری انڈرگراؤنڈ مشینری اُنھیں کے بل بوتے پر چلتی تھی۔ روپیہ پیسہ کے علاوہ پارٹی کو چلانے کے لئے ہر چیز مہیا کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ساتھی بیمار ہوجاتا تھا تو وہ کسی نہ کسی طرح سے اُس ساتھی کے علاج کا انتظام کرتی تھیں۔ اُس وقت اُنھوں نے اپنی ضروریات کو بالکل محدود کردیا تھا۔ اُنھیں اتنا کام کرنا پڑتا تھا کہ آرام نہیں ملتا تھا۔ جس کے نتیجہ میں اُن کی صحت برابر گرتی گئی۔

ڈاکٹروں کو دکھانے پر پتہ چلا کہ اُنھیں لاعلاج و خطرناک مرض کینسر نے دبوچا ہے۔ جس کا آپریشن کرانے وہ بمبئی ٹاٹا میموریل ہسپتال گئیں۔ خاموشی

www.taemeernews.com

ل

سے کامریڈ محمود بھی بمبئی گئے۔ آپریشن ہوا۔ معلوم ہوا کہ آپریشن کامیاب ہوا ہے۔ وہاں سے واپس آکر علی گڈھ میں رہیں۔ میں بھی انڈر گراؤنڈ سے نکلنے سے پہلے اُن سے علی گڈھ ملا۔ جب میں انڈر گراؤنڈ سے باہر آگیا تو وہ بھی لکھنؤ واپس آگئیں۔ پھر اس دفعہ یہ طے کرکے آئی تھیں کہ اپنا سامان لیکر دہرہ دون منتقل ہو جائیں گی۔

کچھ دنوں کے بعد کینسر دوبارہ اُبھر آیا۔ علاج کے لئے پھر بمبئی گئیں۔ ڈاکٹروں نے جواب دیدیا۔ لیکن محمود کی ضد پر علاج کے لئے وہ ماسکو جانے کے لئے تیار ہوگئیں۔ مجھے بھی تار بھیج کر بمبئی بُلایا۔ مجھ سے باتوں میں بتایا کہ "میں اب بچ نہیں سکتی، صرف محمود کی وجہ سے ماسکو جا رہی ہوں۔"

وہ کتنی نحیف و کمزور ہوگئی تھیں کہ اُنھیں بات کرنا بھی دوبھر تھا، پر اس پر بھی اُنھوں نے اپنے دوستوں کو آخری خط لکھائے۔

موت کا ڈر بڑے سے بڑے بہادر کو خوفزدہ کر دیتا ہے پر اُن کا حوصلہ ہمیشہ کی طرح بلند ہی رہا۔

اُس کے بعد اطلاع ملی کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہیں۔

موت نے ایک انسانیت دوست۔ سچے ہمدرد۔ انقلابی۔ بہترین ڈاکٹر۔ ادیب اور ایک باہمت کمیونسٹ کو ہم سے چھین لیا۔ ہمارے دلوں میں اُنکی یادیں ہمیشہ رہیں گی جو ہمیں اپنی منزل کی طرف بڑھنے کے لئے مددگار ثابت ہوں گی۔

نعیم خان

مزار ڈاکٹر رشید جہاں۔ کمیونسٹ ڈاکٹر اور مصنف

www.taemeernews.com

۴

ڈاکٹر رشید جہاں کی قبر پر

سوویت یونین کی انجمن مصنفین کے نمایندے

کامریڈ ایم۔ جے۔ اپلیتین کی تقریر

*

ہم لوگ یہاں ڈاکٹر رشید جہاں کی تازہ قبر پر اُن کو آخری الوداع کہنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ وہ ہندوستان کی مایۂ ناز مصنف اور اپنی قوم کی ایک وفادار بیٹی ہی نہیں، ہماری دوست اور ساتھی بھی تھیں۔ اُن کی وفات وطن سے ہزاروں میل دور مگر اُن کے دوستوں کے درمیان واقع ہوئی ہے۔

ہماری عزیز دوست، آپکے ملک ہندوستان کے مصنفوں نے ہمارے ملک کو قریب سے دیکھا ہے۔ اور ہمارے ملک کے مصنف بھی آپکے ملک جاتے رہتے ہیں۔

اس قسم کے آمد و رفت سے اور ایک دوسرے کے قریب آنے سے ہم نے ایک دوسرے کے تخلیقی عمل کو بخوبی دیکھا اور سمجھا ہے اور اس سے دونوں ملکوں کو قریب تر لانے میں مدد ملی ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں آپکی میزبانی کا موقعہ ہاتھ نہیں لگا۔ اور آپ ہمارے ملک کے مختلف حصّوں میں جاکر ہمارے ملک کے عوام اور مصنفوں سے مل نہیں پائیں آپ کے مہلک مرض نے ہم سے وہ موقعہ زبردستی چھین لیا۔

لیکن ہم آپ سے خوب اچھی طرح واقف ہیں اور آپکی تصانیف اور تحریریں

www.taemeernews.com

ن

ایک عام ہندوستانی شہری کے لئے جو اٹوٹ محبت بھری ہوئی ہے اور اپنے عوام کے لئے خوشحالی، آزادی اور ملک کی ترقی کے حقوق کی جدوجہد کی جو مشعل آپ نے اپنی تحریروں سے روشن کی ہے، ہم سب اُسکے معترف اور قائل ہیں۔ ہم آپ کے افسانہ "خدا کہاں ہے" کی ہیروئن درگا سے بھی واقف ہیں۔ ایک ڈاکٹر کی دوستانہ مسکراہٹ درگا کو آگے بڑھنے میں سہارا دیتی ہے کیونکہ وہی ایک فرد ہے جو درگا کے تیکھے سوالوں کا جواب دینے کی اہل تھی۔ درگا نے انسان کی زندگی میں محنت کی قدر و منزلت کو سمجھا تھا اور محترم رشید جہاں آپ خود وہ ڈاکٹر، دوست اور مصنف تھیں۔

ہماری تمنا ہے کہ سوویت یونین میں آپ کی آمد سے اُس حقیقت پسندانہ تخلیقی کام کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی جس کے لئے آپ نے اپنی ساری زندگی وقف کردی۔

آپ کے ملک کی عظیم کتاب "رامائن" میں ایک مصرعہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ "صرف جذبات اور خیالات سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے"، یہ مصرعہ تا زندگی میرے دماغ پر نقش رہے گا۔ آپ اِس بات سے خود اچھی طرح سے واقف ہیں اور اپنی زندگی میں آپ نے اپنی تحریر کو عمل کی حقیقتوں سے وابستہ کیا ہے۔ ہم اِسی لئے آپ سے ازحد محبت کرتے ہیں۔

عزیز دوست، سوویت مصنفین کی طرف سے آپ کو ہمارا آخری سلام قبول کریں۔ الوداع۔ آپ کی یاد ہمیشہ آتی رہے گی۔

———— ※ ————

www.taemeernews.com

037
www.taemeernews.com

افطاری

"روزہ دار روزہ کھلوا دے۔ اللہ تیرا بھلا کرے گا" کی صدائیں ڈیوڑھی سے آئیں۔ ڈپٹی صاحب کی بیگم صاحبہ جن کا مزاج پہلے ہی سے چڑچڑا تھا۔ نامعلوم کم بخت یہ سالے دن کہاں مرجاتے ہیں۔ روزہ بھی تو چین سے نہیں کھولنے دیتے!"

"اللہ تیرا بھلا کرے گا!" کی کانپتی آواز پھر گھر میں پہونچی۔

"نصیباً۔ اری او نصیباً۔" دیکھ وہاں قفلی میں کچھ جلیبیاں پرسوں کی بچی ہوئی رکھی ہیں فقیر کو دے دے۔"

نصیباً نے پوچھا کہ "اور بھی کچھ؟"

"اور کچھ چاہیئے! سارا گھر اٹھا کر نہ دیدے۔"

نصیباً دوپٹہ سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی۔ برآمدے میں تخت پر بیگم صاحبہ بیٹھی تھیں۔ دسترخوان سامنے بچھا تھا جس پر چند افطاری کی چیزیں چنی ہوئی تھیں اور کچھ ابھی تلی جا رہی تھیں۔ منٹ منٹ میں گھڑی دیکھ رہی تھیں کہ

www.taemeernews.com

کب روزہ کھلے اور کب وہ پان اور تمبا کو کھائیں ۔ ویسے ہی بیگم صاحبہ کا مزاج کیا کم تھا لیکن رمضان میں تو ان کی خوش مزاجی نوکروں میں ایک کہاوت کی طرح مشہور تھی ۔ سب سے زیادہ آفت بے چاری نصیبا کی آتی تھی ۔ گھر کی پلی چھوکری تھی ۔ بیگم صاحبہ کے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہ تھا اور بیگم صاحبہ اپنی اس ماہتا کو نصیباؔ کی اکثر مرمت کر کے پورا کر لیا کرتی تھیں حالانکہ گرمی رخصت ہو گئی تھی لیکن پھر بھی ایک پنکھا بیگم صاحبہ کے قریب رکھا رہتا تھا ۔ جو ضرورت کے وقت نصیباؔ کی خبر لینے میں کام آتا تھا ۔

"ارے کیا وہیں مرگئی! نکلتی کیوں نہیں!" نصیباؔ نے جلدی سے منہ پونچھا جلیبیاں لے کر ڈیوڑھی کی طرف چلی ۔

ادھر تو دکھا ۔ کتنی ہیں ۔"

نصیباؔ نے آکر ہاتھ پھیلا دیا ۔ اس میں صرف دو جلیبیاں تھیں ۔

"دو! بیگم صاحبہ زور سے چیخ پڑیں ۔" اری اجڑی اس میں تو زیادہ تھیں ۔ ادھر تو آ ... کیا تو کھا گئی ؟"

"جی نہیں ... نصیباؔ منہ ہی منہ میں منمنائی ۔ لیکن بیگم صاحبہ کی ایکسرے نگاہوں نے جلیبی کے ٹکڑے نصیباؔ کے دانتوں میں لگے دیکھ ہی لئے ۔ بس پھر کیا تھا آؤ دیکھا نہ تاؤ ۔ پنکھا اٹھا کر پل ہی تو پڑیں ۔" حرام زادی ۔ یہ تیرا روزہ ہے! قطامہ! تجھ سے آدھ گھنٹے اور نہ صبر کیا گیا ۔ ٹھہر تو! میں تجھے چوری کا مزا چکھاتی ہوں ......"

"اللہ تیرا بھلا کرے گا آپا ہیچ کا روزہ کھلوا دے ۔"

"اب نہیں ... اچھی بیگم صاحب اب نہیں ۔ اللہ بیگم صاحب معاف کیجئے ۔ اچھی بیگم صاحب ۔ اچھی ...."

www.taemeernews.com

نصیباً گڑگڑانے لگی۔
اب نہیں... اب نہیں کیسی... ٹھہر تو تو امردار تیرا دم ہی نہ نکال کر چھوڑا ہو۔ روزہ توڑنے کا مزہ ا۔"
"تیرے بال بچوں کی خیر ا روزدار کا روزہ ا۔"
جب بیگم صاحبہ بے دم ہو کر ہانپنے لگیں تو نصیباً کو دھکا دے کر بولیں "جا کم بخت ا جا کر فقیر کو یہ جلیبیاں دے آ۔ بے چارہ بڑی دیر سے چیخ رہا تھا۔ اور لے یہ دال بھی...."
بیگم صاحبہ نے تھوڑی سی دال نصیباً کی مٹھی میں ڈال دی۔ نصیباً سسکیاں بھرتی ہوئی ڈیوڑھی پر گئی۔ وہ جلیبیاں اور دال فقیر کو دے آئی۔
نئی سڑک جو شاید کبھی نئی ہو۔ اب تو پرانی اور ردی حالت میں تھی اس کے دونوں طرف گھر تھے۔ بس کہیں کہیں کوئی مکان ذرا اچھی حالت میں نظر آجاتا تھا۔ زیادہ تر مکان پرانے اور بوسیدہ تھے جو اس محلے کی گری ہوئی حالت کا پتہ بتاتے تھے۔ یہ سڑک ذرا چوڑی تھی جس کو رنگریز، دھوبی، جلاہے اور لوہار وغیرہ علاوہ چلنے پھرنے کے آنگن کی طرح استعمال کرنے پر بھی مجبور تھے۔ گرمیوں میں اتنی چارپائیاں بچھی ہوتی تھیں کہ یکہ بھی مشکل سے نکل سکتا تھا۔
اس محلہ میں زیادہ تر مسلمان آباد تھے۔ علاوہ گھروں کے یہاں تین مسجدیں تھیں۔ ان مسجدوں کے ملاؤں میں ایک قسم کی بازی لگی رہتی تھی کہ کون ان جاہل غریبوں کو زیادہ الو بنائے اور کون ان کی گاڑھی کمائی میں سے زیادہ ہضم کرے یہ ملا بچوں کو قرآن پڑھانے سے لے کر جھاڑ پھونک۔ تعویذ۔ گنڈا غرض کہ ہر ان طریقوں کے استاد تھے کہ جس سے وہ ان جلاہوں اور لوہاروں کو بے وقوف بنا سکیں۔ یہ تین بیکار اور فضول خاندان ان محنت کرنے والے انسانوں

040
www.taemeernews.com

کے بیچ میں اس طرح رہتے تھے کہ جس طرح گھنے جنگلوں میں دیمک رہتی ہے اور آہستہ آہستہ درختوں کو چاٹتی رہتی ہے۔ یہ ملا سفید پوش تھے اور ان کے پیٹ پالنے والے میلے اور گندے تھے۔ یہ ملا صاحبان سید اور شریف زادے تھے اور یہ محنت کش رذیل اور کمینوں میں گنے جاتے تھے۔

اس محلے میں ایک ٹوٹا ہوا مکان تھا۔ نیچے کے حصہ میں کباڑی کی دوکان تھی اور اوپر کوئی پندرہ بیس خاندان رہتے تھے۔ اوپر کی منزل کا بارجہ سڑک کی جانب کھلتا تھا۔ یہ خان سرحد کے رہنے والے تھے اور سب کے سب سود پر روپیہ چلاتے تھے۔ یہ لوگ صدسے زیادہ گندے تھے محلے والے تک ان سے بہت ڈرتے تھے، ایک تو زیادہ تر لوگ ان کے قرضدار تھے دوسرے ان کی نگاہ ایسی بری تھی کہ اکیلی عورت کی ہمت ان کے گھر کے سامنے سے ہو کر نکلنے کی نہ ہوتی تھی۔ دن بھر ان کے گھر میں تالا پڑا رہتا تھا۔ شام کو جب یہ لوگ واپس آتے تو ایک چھوٹی دیگ میں گوشت ابال لیتے۔ بازار سے نان لے کر اسی ایک برتن میں ہاتھ ڈال ڈال کر کھانا کھا لیتے اور چوسی ہوئی ہڈیاں نیچے سڑک پر پھینکتے جاتے۔ جب ان کے کھانے کا وقت ہوتا تو شام کو بہت سے کتے جمع ہو جاتے اور دیر تک غرغر بھوں بھوں کی آوازیں آتی رہتیں۔

اپنا پیٹ بھر کر یہ خان بہی کھاتے کھول کر بیٹھ جاتے۔ حساب کتاب کرنے لگتے پھر کچھ اپنے کنبل بچھا کر اور حقہ لے کر سونے کو لیٹ جاتے اور چند منچلے شہر کی سیر گشت کو نکل کھڑے ہوتے۔

نماز روزہ کا ایک سود کھانے والا خان بڑا پابند ہوتا ہے اور اپنے کو سچا مسلمان سمجھتا ہے۔ حالانکہ اس کے مذہب نے سود لینے کو بالکل منع کیا ہے لیکن یہ سود کو نفع کہہ کر ہضم کر جاتا ہے اور اپنے خدا کے حضور میں اپنی عبادت (پوجا)

041 www.taemeernews.com

ایک رشوت کی شکل میں پیش کرتا رہتا ہے۔ آج کل رمضان تھا تو سب خان بھی روزہ رکھے ہوئے تھے اور افطار کے خیال سے جلدی گھر لوٹ آتے تھے۔ ان کا دل بہلانے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ اپنے چھجے پر کھڑے ہو کر سڑک کی سیر کریں۔ اور کوئی اکا دکا عورت گزرے تو اس پر آوازیں کسیں۔ ان کے سامنے کا جو گھر تھا اس کی کھڑکیاں تو کبھی کھلتی ہی نہ تھیں۔ کبھی کبھار روشنی سے پتہ چلتا تھا کہ پھر کوئی کرایہ دار آگیا ہے۔ آخر کو ایک دن چھکڑے اور تانگے آتے اور گھر پھر خالی ہو جاتا۔

ایک دن اصغر صاحب گھر تلاش کرتے پھرتے تھے۔ اس گھر کو بھی دیکھا۔ اس وقت خان باہر گئے ہوئے تھے گھر میں تالا پڑا ہوا تھا۔ اصغر صاحب نے گھر کو پسند کیا۔ خاص کر کرایہ کو۔ قلعی وغیرہ ہو جانے پر وہ اپنی بیوی بچے اور ماں کے گھر آگئے۔ ان کی بیوی نسیمہ کو گھر بہت پسند آیا۔ اگر آس پاس کا محلہ گندہ اور بوسیدہ حالت میں ہے تو ہوا کرے لیکن بیس روپیہ میں اتنا بڑا مکان کہاں ملا جاتا تھا۔ اس نے گھر کو فوراً سجانے اور ٹھیک کرنے کا ارادہ کر لیا۔ شام کو وہ اپنی کھڑکی میں سے جھانک کر باہر سڑک پر بچوں کی بھاگ دوڑ دیکھ رہی تھی کہ اس کی ساس بھی آ کھڑی ہوئیں اور باہر دیکھنے لگیں اور ایک دم "اوئی" کہہ کر پیچھے ہٹ گئیں۔

"اے دیکھ تو ان موٹے مسٹنڈے خانوں کو۔ چھوٹیں ان کے دیدے۔ ادھر دیکھ دیکھ کر کیسے ہنس رہے ہیں!"

نسیمہ نے نگاہ موڑی دیکھا کہ کئی خان اپنے چھجے پر دانت نکالے اس کی طرف گھور رہے ہیں نسیمہ کے ادھر دیکھتے ہی خانوں کی فوج میں ایک حرکت ہوئی اور وہ زور زور سے باتیں کرنے لگے۔ شکر تو یہ تھا کہ ان کا گھر ذرا ترچھا

042
www.taemeernews.com

تھا لیکن پھر بھی سامنا خوب ہوتا تھا۔

"اے دلھن کھڑکی بند کر کے ہٹ جاؤ۔ یہ کیسا بے پردہ گھر اصغر نے لیا ہے میں تو یہاں دو روز تک نہیں ٹک سکتی۔"

نسیمہ نے جواب نہیں دیا اور خانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر برابر دیکھتی رہی۔ ساس وہاں سے بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں "مردوں کو کون کہے جب عورتیں ہی شرم نہ کریں"۔

اصغر اور نسیمہ کی زندگی میں اب سے نہیں کچھ عرصہ سے رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی۔ ان دونوں کی منگنی بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے بڑھتے گئے پردہ بھی بڑھتا گیا مگر آنکھ مچولی جیسے اپنے ہاں اکثر منگیتروں میں ہوتی ہے ان میں بھی ہوتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہونچی ہوئی تھی کہ چھپ چھپ کر خط بھی لکھا کرتے تھے۔

اصغر جب کالج میں پڑھتے تھے تو نوجوانی کا زمانہ تھا۔ طبیعت میں جوش تھا اور ان لڑکوں کا ساتھی تھا جو ملک کی آزادی کا درد دل میں رکھتے تھے۔ اس کی جوشیلی تقریریں اور دیا کھیان، انگریزوں کے ظلم، زمینداروں کی بیگار، کسانوں کی مصیبت، سرمایہ داروں کی لوٹ اور مزدوروں کے سنگٹھن کے بارے میں بہت مشہور تھیں۔ بولنے والا غضب کا تھا۔ دیا رکھیوں کی دنیا میں وہ ہر جگہ مشہور تھا۔ دیش کو اس سے بہت آشائیں تھیں۔ اور نسیمہ کو اس سے بھی زیادہ۔ اصغر اپنی کالج کی زندگی کی سب باتیں نسیمہ کو لکھتا رہتا۔ اور جب وہ اخبار تھا میں اس کا نام دیکھتی تو نسیمہ کا سر غرور سے اونچا ہو جاتا۔ اس کی کسی سہیلی کا بھائی یا منگیتر ایسا دیش بھگت نہیں تھا۔ نسیمہ نے بھی اپنے کو ایک نئی زندگی کے لئے تیار کرنا شروع کیا۔

043
www.taemeernews.com

عقلمند کو اشارہ کافی ۔ ہوشیار لڑکی تھی وہ اپنے سماج کے روگوں کو اچھی طرح سمجھنے لگی ۔ اور ساتھ ہی ان کو سدھارنے کی تصویریں بھی اپنے دماغ میں کھینچنے لگی دیش کو آزاد کرنے اور اس کو سکھ پہونچانے کے لئے وہ ہر قسم کا بلیدان کرنے کی تیاری کرنے لگی ۔ آزادی کے نام سے اس کو عشق ہو گیا تھا ۔ وہ اس پر اپنی جان بھی قربان کر سکتی تھی ۔

جیسے ہی اصغر نے بی ۔ اے کیا ۔ دونوں کی شادی ہو گئی اور ساتھ رہنے سے نسیمہ کو پتہ چلا کہ اصغر کی روشن خیالی ایک چھوٹے سے دائرے کے اندر بند ہے انھوں نے اتنا تو ضرور کیا کہ اپنے چند دوستوں سے بیوی کو ملوا دیا تھا ۔ ان لوگوں سے بات چیت کرنے کے بعد نسیمہ کی سوچ اور سمجھ میں زیادہ ترقی ہو گئی اور اس کو خود آگے بڑھ کے کام کرنے کی خواہش ہوئی ۔

ایک طرف تو نسیمہ کا شوق اور جوش بڑھ رہا تھا اور دوسری طرف اصغر آہستہ آہستہ ڈھیلے پڑتے جاتے تھے ۔ کہتے کچھ تھے اور کرتے کچھ تھے ۔ جس آسانی کے ساتھ دوستوں کے ساتھ بہانے بازی کر سکتے تھے نسیمہ کے ساتھ نہیں کر پاتے تھے کبھی کہتے تھے کہ ابھی تو ہمارے ہاں بچہ ہونے والا ہے ! پھر یہ کہ بچہ چھوٹا ہے کبھی کہا کہ وکالت ختم کر لینے دو ، وکالت ختم بھی نہ کی تھی کہ نوکر ہو گئے ۔ نوکری بھی کی تو سرکاری اور اپنے پرانے دوستوں سے الگ ہونے لگے ۔

آخر کب تک نسیمہ سے اپنے دل کا حال چھپا سکتے تھے ۔ باہر تو بیوی بچوں کا بہانہ تھا ۔ لیکن گھر میں کیا کہتے ۔ نسیمہ بھی سمجھ گئی کہ یہ کرنے دھرنے والے تو کچھ ہیں نہیں ۔ صرف باتیں ملانے کے ہیں ۔ جب کبھی پرانے دوست اتفاق سے مل جاتے تو پھر اصغر صاحب وہیں زبانی جمع خرچ شروع کر دیتے اور اپنی غیر سیاسی زندگی کو ایک مصیبت بنا کر دوستوں کے سامنے پیش کر دیتے اور سب یہی خیال

www.taemeernews.com

کرتے کہ نسیمہ ہی ان کو بہکانے کی ذمہ دار ہے۔ میاں کی اس موقع پرستی سے دونوں کے دلوں میں گرہ پڑ گئی اور نسیمہ نے ایک خاموشی اختیار کر لی۔

اب تو اصغر کے دوست ڈھیلے ڈھالے قسم کے وکیل اور سرکاری ملازم تھے اور جن میں سی۔ آئی۔ ڈی والے بھی شامل تھے۔ نسیمہ کے پاس اکیلے بیٹھتے ہوئے انھیں ایک الجھن سی ہوتی تھی۔ کیونکہ اصغر کے دل میں ایک چور تھا اور جانتے تھے کہ اس چور کا پتہ نسیمہ کو خوب اچھی طرح معلوم ہے۔ نسیمہ کی ہر بات ان کو ایک طعنہ نظر آتی تھی۔ اس کی سرد خاموشی سے ان کو ایک جھنجھلاہٹ آجاتی تھی اور ان کا دل چاہتا تھا کہ وہ نسیمہ کے خوبصورت چہرے پر ایک زور کا تھپڑ مار بیٹھیں۔ اگر نسیمہ ان سے لڑتی، باتیں سناتی اور طعنے دے کر ان کے دل کو چھلنی کر دیتی تو ان کو تکلیف نہ ہوتی جتنی کہ اصغر کو اس کی خاموش حقارت سے ہوتی تھی۔

افطار کا وقت قریب تھا۔ سب خان دریچہ میں موجود تھے۔ کچھ کھڑے تھے کچھ چائے پکا رہے تھے۔ نسیمہ بھی معہ اسلم کے اپنی کھڑکی میں سے جھانک رہی تھی۔ اب دو مہینے کے قریب ان کو اس گھر میں آئے ہوئے ہو گئے تھے۔ خان اس کی صورت اور لاپروائی کے عادی ہو چکے تھے۔ اب خواہ نسیمہ وہاں گھنٹوں کھڑی رہے خان اس کی طرف دھیان نہ دیتے تھے اس وقت بھی ان کی آنکھیں اور کان قریب کی مسجد کی طرف لگے ہوئے تھے۔

افطار میں ابھی دیر باقی تھی کہ ایک بڈھا فقیر گلی میں سے نکل کر سڑک پر آیا اور جس طرح وہ ٹوٹتا ہوا چل رہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ اندھا بھی ہے اس کے سارے جسم میں رعشہ تھا۔ جس لکڑی کے سہارے وہ چل رہا تھا وہ بھی مشکل سے تھام سکتا تھا۔ اس کی مٹھی میں کوئی چیز تھی جو اس کے ہاتھوں کے

045
www.taemeernews.com

کانپنے کی وجہ سے دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھ کر نسیمہ کے گھر کے سامنے ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

"دیکھو اماں، اس فقیر کے ہاتھ میں کیا ہے۔"

نسیمہ نے غور سے دیکھ کر کہا "کچھ کھانے کی چیز معلوم ہوتی ہے۔"

"تو کھا کیوں نہیں لیتا؟"

"روزے سے ہوگا۔ شاید اذان کا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"اماں تم روزہ نہیں رکھتیں؟"

نسیمہ نے مسکرا کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ "نہیں۔"

"ابا نے داروغہ جی سے کیوں کہا تھا کہ ان کا بھی روزہ ہے؟ کیا ابا نے جھوٹ بولا تھا۔"

نسیمہ نے کچھ دیر سوچ کر جواب دیا۔ "تم خود ان سے پوچھ لینا۔"

"تو اماں تم روزہ کیوں نہیں رکھتیں؟"

"تم جو نہیں رکھتے!" نسیمہ نے اسلم کو چھیڑا۔

"میں تو چھوٹا ہوں! دادی اماں کہتی ہیں کہ جو بڑا ہو جائے اور روزہ نہیں رکھے وہ دوزخ میں جاتا ہے۔ اماں دوزخ کیا ہوتی ہے"؟

"دوزخ! دوزخ وہ تمہارے سامنے تو ہے!"

"کہاں۔؟" اسلم نے چاروں طرف گردن گھما کر دیکھا۔

"وہ نیچے جہاں اندھا فقیر کھڑا ہے۔ جہاں وہ جلاہے رہتے ہیں اور جہاں وہ رنگریز رہتا ہے اور لوہار بھی...."

"دادی اماں تو کہتی ہیں دوزخ میں آگ ہوتی ہے؟"

"ہاں آگ ہوتی ہے! لیکن ایسی تھوڑی ہی ہوتی ہے جیسے ہمارے چولھے

046
www.taemeernews.com

ہیں۔ دوزخ کی آگ بیٹا بھوک کی آگ ہوتی ہے۔ اکثر وہاں کھانے کو ملتا ہی نہیں اور جو ملتا بھی ہے تو بہت برا اور تھوڑا سا۔ محنت بھی بہت کرنی پڑتی ہے اور کپڑے بھی دوزخ والوں کے پاس پھٹے پرانے پیوند لگے ہوتے ہیں۔ ان کے گھر بھی چھوٹے چھوٹے اندھیرے جوہڑوں اور کھٹملوں سے بھرے ہوتے ہیں اور اسلم میاں دوزخ کے بچوں کے پاس کھلونے بھی نہیں ہوتے....."

"کلو کے پاس بھی کوئی کھلونا نہیں ہے۔ اماں وہ دوزخ میں جو رہتا ہے۔"

"ہاں"

"اور جنت؟"

"جنت یہ ہے جہاں ہم اور تم اور چچا جان اور خالہ جان رہتے ہیں۔ بڑا سا گھر ہو۔ صاف ستھرا کھانے کو مزے مزے کی چیزیں۔ مکھن، توس، پھل انڈا، سالن۔ دودھ سب کچھ ہوتا ہے۔ بچوں کے پاس اچھے کپڑے اور کھیلنے کو اچھی سی موٹر ہوتی ہے۔"

"تو اماں سب لوگ جنت میں کیوں نہیں رہتے؟"

"اس لئے میری جان کہ جو لوگ جنت میں رہتے ہیں وہ ان لوگوں کو گھسنے نہیں دیتے۔ اپنا کام تو کروا لیتے ہیں۔ اور ان کو پھر دوزخ میں دھکا دے دیتے ہیں۔"

"اور وہ اندھے بھی ہو جاتے ہیں؟"

"ہاں بیٹا! دوزخ میں اندھے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔"

"تو وہ کھاتے کیسے ہیں؟"

اتنے میں اذان کی آواز آئی اور گولہ چلا۔ خان چائے پر لپکے اور بڈھے فقیر نے جلیبیاں جلدی منہ کی طرف بڑھائیں۔ رعشہ اور بڑھ گیا۔ اس کے

047 www.taemeernews.com

ہاتھ زیادہ کانپنے لگے اور سر بھی زور زور سے ہلنے لگا۔ بڑی مشکل سے ہاتھ منھ تک پہونچایا اور جب منھ کھول کر جلیبیاں منھ میں ڈالنے لگا تو رعشہ کی وجہ سے جلیبیاں ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑیں۔ ساتھ ہی بڈھا بھی جلدی سے گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑا اور اپنے کانپتے ہاتھوں سے جلیبیاں ڈھونڈھنے لگا۔ ادھر ایک کتا جلیبیوں پر لپکا اور جلدی سے جلیبیاں کھا گیا۔ دوسرے کتے بھی بڑھے۔ بڈھے نے ان کو ڈانٹا۔ کتے اس پر غرانے لگے۔ بڈھا نڈھال ہو کر زمین پر بیٹھ گیا اور بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔

خان جو ادھر دیکھ رہے تھے انھوں نے یہ سین دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا اور بڈھے کی شکل و صورت اور بے چارگی پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

چھوٹا اسلم سہم کر نسیمہ سے چمٹ گیا اور بولا "اماں!"

اس کے ننھے سے دماغ نے پہلی دفعہ دوزخ کی اصلی تصویر دیکھی تھی نسیمہ نے خانوں کی طرف غصہ سے دیکھ کر کہا "یہ کم بخت......"

اسلم نے پھر دبی ہوئی آواز میں کہا۔ "اماں"

نسیمہ نے جھک کر اس کو گود میں اٹھا لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر جوش سے کہا "میری جان! جب تم بڑے ہوگے تو اس دوزخ کا مٹانا تمھارا ہی کام ہوگا۔"

"اور ماں تم؟"

"میں بیٹا! اب اس قید میں سے کہاں جا سکتی ہوں"

"کیوں۔ ابھی تو تم دادی کی طرح بڈھی نہیں ہوئی کہ چل نہ سکو" ننھے سے اسلم نے ماں کی سنجیدگی کی نقل کرتے ہوئے جواب دیا۔ "تم بھی چلنا اماں!"

"اچھا میرے لال تمھارے ساتھ ضرور چلوں گی"

048
www.taemeernews.com

مجرم کون؟

شام کا وقت ہے انگلش کلب میں آج بہت رونق ہے۔ سڑک پر دور دور تک موٹریں کھڑی ہیں۔ دیواروں پر ٹینس کے نیلے پردے کسے ہوئے ہیں جو اندر کی کارروائی گندی اور غلیظ ہندستانی آنکھوں سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی کسی نہ کسی صاحب یا میم صاحب یا کسی ہندستانی افسر پر نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ کلب کے سامنے ہاکی کھیلنے کا ایک بڑا میدان ہے جس پر اپنے کئی ہندستانی بھائی جمع ہو گئے ہیں۔ کچھ چل پھر رہے ہیں لیکن منھ سب کے کلب کی طرف ہیں۔ نہ معلوم وہ کیوں جمع ہیں۔ غالباً پردوں اور موٹروں کی چہل پہل نے ان میں ایک خواہش ایک جستجو پیدا کر دی ہے اور وہ تماشا دیکھنے کے انتظار میں جمع ہیں۔

"یار دیکھو وہ بجلی والے صاحب ہیں۔"

"اور میم کس کی بغل میں دبائے ہیں۔"

قہقہہ پڑتا ہے۔

www.taemeernews.com

"اجی یہ لوگ بھی خوب ہیں۔ چاہے کوئی میم ہو۔۔۔"
"تیرا دل بھی صاحب بہادر بننے کو چاہتا ہے۔ نکال نہ اپنی جورو کو۔ ہم بھی ذرا بھابی کے درشن کریں۔"
"تم نے سنا نہیں یار۔ وہ تو کانی بھی ہے اور ننگڑی بھی۔" سب ہنسنے لگے۔
"ارے یہ کون ہیں یہ تو کالے ہیں۔ ان کا یہاں کیسے گذر ہو گیا؟"
"کوا چلا ہنس کی چال۔ اپنی بھی بھول گیا" اس پر بہت زور کا قہقہہ پڑا
"دیکھو دیکھو وہ پھانسی ڈالا آ گیا۔"
"اجی وہ دیکھو موٹر سے وہ جج صاحب اتر رہے۔"
"ارے یار بڑا انصاف کرتے ہیں۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی۔ خدا قسم! ادھر جب میں فتو والی مار پیٹ میں پھنس گیا تھا تو جج صاحب نے صاف چھوڑ دیا!"
"ابے سالے چپ بھی رہ۔ نہیں تو کھینچ دوں گا ایک ہاتھ۔ تتو سے تو پوچھ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔"
"چلو یار چھوڑو اس مردود کو یہاں۔ وہ جینٹ صاحب کی لڑکی تو آتی نظر نہیں آئی۔"

آج جج رابنسن صاحب کی الوداعی پارٹی ہے۔ وہ آٹھ مہینے کی چھٹی پر ولایت شادی کرنے جا رہے ہیں اپنے زمانے کے صحیح جج ثابت ہوئے ہیں۔ کلب میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ شہر کے انگریزوں کی تو وہ گویا جان تھے۔ ہندستانی اعلیٰ افسروں کی پیٹھ بھی کافی تھپک دیتے تھے۔ کبھی کبھار ان کو کھانے یا چائے پر بھی بلا لیتے تھے۔ اس لئے وہ بھی ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ باقی "نیٹو" آبادی پر صاحب کا کافی رعب و داب تھا۔ بعض لوگ کلکٹر صاحب سے اتنا نہ ڈرتے تھے جتنا کہ ان سے۔ لوگوں کو یہ بھی معلوم تھا کہ یہ ان چند انگریز ججوں میں سے ہیں

050

www.taemeernews.com

جو رشوت نہیں لیتے۔ تو لوگ عزت بھی کرتے تھے۔ قانون کو ایسا سمجھتے تھے کہ صوبہ میں کم جج ان کا مقابلہ کرتے تھے۔ بس یہ کہو کہ اس انگریزی قانون کی جو انھوں نے غلاموں کے لئے بنایا تھا ان سے اچھی ترجمانی کوئی نہ کر سکتا تھا۔ ان کو اپنی ایمانداری اور انصاف پر ناز تھا۔

کالے آدمیوں سے صاحب لوگ اپنی زندگی کے بارے میں ہزار چھپائیں لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ خبر باہر نکل ہی آتی ہے۔ تین سال ہوئے جج رابنسن چھٹی کا کچھ حصہ شملے پر گذار رہے تھے کہ وہ ایک مسز بلیک سے ملے مسز بلیک بیس اکیس سال کی خوبصورت لڑکی تھی چند مہینے پہلے کرنل بلیک سے شادی کر کے ہندوستان آئی تھی۔ کرنل صاحب فیروزپور میں تھے۔ اور وہ جلدی جلدی شملے آتے جاتے رہتے تھے لیکن جب رابنسن صاحب وہاں پہونچے تو سلویا سے بھی ملے۔ دو تین دن ہی میں دونوں میں اتنی بے تکلفی ہو گئی کہ اچھے خاصے دوست ہو گئے اور بہت جلدی دوستی عشق کی حد تک پہونچ گئی۔ رابنسن ان خوش قسمت انگریزوں میں تھا جس پر کئی عورتوں کی آنکھ تھی۔ اور رابنسن جہاں کہیں جاتا ان کی آنکھوں کا تارا بنا رہتا تھا۔ عشق ایک نہیں کئی ہوئے تھے۔ شادی شدہ غیر شادی شدہ ہر قسم کی عورتوں سے۔ لیکن یہ بھوت ہی کچھ اور تھا۔ مسز بلیک تو بس دنیا و مافیہا کو بھول چکی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا سوسائٹی میں خیال رکھا جاتا ہے کہ پردہ فاش نہ ہو۔ اس کو تو یہ کھیل جیسے آتا ہی نہ تھا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جس کا جی چاہے پڑھ لے۔ ہر طرف جارج رابنسن لکھا ہوا تھا۔ رابنسن نے اس کو سمجھایا بھی۔ اس کا جواب یہی ملا "مجھے تو کوئی ڈر نہیں۔ تمھیں ڈر ہو تو مجھ سے نہ ملو"

آخر کو اور بھی عورتیں ہوٹل میں تھیں۔ جن میں سے اکثر رابنسن پر ریجھی

051 www.taemeernews.com

ہوئی تھیں۔ کئی سلویا بلیک کے حسن سے خار کھائے بیٹھی تھیں۔ عشق برابر ہوٹل میں چلا ہی کرتے تھے۔ چھیڑ چھاڑ، ہنسی مذاق، چھپ کے ملنا، راتیں ساتھ گذارنا بھی کچھ برا نہ تھا۔ اس کے خاص سلیقے اور قاعدے بن جاتے ہیں۔ لیکن ایسا کھلم کھلا عشق وہ بھی ایک شادی شدہ عورت کا سوسائٹی کیسے برداشت کرلیتی۔ پہلے چہ میگوئیاں ہوئیں پھر باتیں ہوئیں۔ آوازے کسے گئے۔ کرنل صاحب بھی آئے۔ بیوی کا رنگ ہی اور دیکھا۔ بات کو پی گئے لیکن آخر کہاں تک ایک روز مسز بلیک شملہ سے غائب ہوگئیں۔ تین دن سہارن پور جا کر رہیں پتہ لگانے والوں نے لگا ہی لیا۔ رابنسن ہندستان میں دس سال سے تھا۔ اونچ نیچ کو اچھی طرح سمجھتا تھا لیکن پھر کیا کرتا۔ مجبور تھا۔ محبت اختیار میں نہ تھی۔ معاملہ طشت از بام ہوگیا۔ کرنل دیوانہ ہو کر انتقام لینے پر آمادہ ہوگیا۔ اس کو بھی ضد پڑ گئی کہ وہ ضرور رابنسن پر اپنی بیوی بھگا لے جانے کا دعویٰ کرے گا۔ بلکہ اس نے وکیلوں سے کوئی نہ کوئی مطلب کا قانون نکالنے کی باتیں بھی شروع کردیں۔ رابنسن بہت چکرایا۔ لیکن کرتا تو کیا۔ معاملہ بہت بگڑ چکا تھا۔ خود کرنل سے ملا۔ دوستوں سے کہلوایا۔ لیکن بلیک اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس طرح دو انگریز دل میں کھلم کھلا مقدمہ بازی کرنا انگریزی رعب و داب میں فرق ڈالنا تھا۔ لہٰذا ادھر گورنر تک اور ادھر کمانڈر انچیف کے کانوں تک خبر پہونچائی گئی ایک زبردست دباؤ کے بعد کرنل صاحب راضی ہوئے کہ وہ بجائے رابنسن پر دفعہ ۴۹۶ کا مقدمہ چلانے کے اپنی بیوی کو طلاق دے دیگا اور مسز بلیک کو فوراً ولایت روانہ کیا گیا کہ جب تک وہ طلاق کی کارروائی پوری نہ ہو وہ وہیں رہیں۔

اس عرصہ میں کہ طلاق کی کارروائی جاری تھی۔ رابنسن ولایت ایک مرتبہ ہوائی جہاز سے اپنی معشوقہ سے مل آئے تھے۔ اب وہ آٹھ ماہ کے لئے جا رہے تھے

052

www.taemeernews.com

ایک ایک لمحہ ہندستان میں کاٹنا مشکل تھا۔ چلنے سے پہلے سلویا کا ایک تار ملا تھا کہ "میں تم کو وینس میں مل جاؤں گی"۔ اس تار نے رابنسن کو بالکل ہلا دیا۔ وہ بہت دیر تک سر جھکائے سلویا کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا عورت ہے غضب کی۔ پہاڑوں کی چاندنی راتیں، ہوٹل میں چھپ چھپ کر ملنا۔ ہزاروں نگاہوں سے چھپ کر راتوں کو اس کے پاس آنا۔ بلیک کی نگہداشت کے باوجود بھی آنا۔ اور پھر اس کی گود میں سر رکھ کر آہستہ سے کہنا "کیا کروں بہت کرتی ہوں لیکن جارج تم سے محبت نہیں جاتی"۔ اس کا خیال ہی چکرا دیتا تھا اور پھر وہ ہاتھ وہ گردن وہ جسم! جب وہ پہلی دفعہ اس کے ساتھ آئی تھی تو کیا سین ہوٹل میں نہ ہوا تھا! لوگوں نے کیا کیا ناک بھوئیں نہ چڑھائے تھے۔ لیکن اس نے اگر نہایت سادگی سے اتنا کہا "جارج میں آگئی" گو رابنسن پارٹی میں گھوم رہا تھا۔ لوگوں سے باتیں کر رہا تھا لیکن اس کا دل وہاں نہ تھا۔ اس کو تشویش تھی تو یہ کہ وہ سلویا سی لاجواب عورت کو خوش بھی رکھ سکے گا یا نہیں۔

"بھولا! تمہارے خلاف گجریا کو دوسری دفعہ بھگانے کا جو جرم لگایا ہے وہ ثابت ہے۔ تم کو تین سال کی سخت سزا کا حکم سنایا جاتا ہے۔" "اور تم کو عورت گجریا واپس دی جاتی ہے۔"

یہ حکم سنا کر رابنسن صاحب کانسٹبل کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا "لے جاؤ ملزم کو۔" ان کا یہ کہنا تھا کہ ایک گندمی رنگ درمیانہ قد کی سولہ سترہ سال کی لڑکی چند مردوں کو چیرتی ہوئی جا کر بھولا سے لپٹ گئی۔ اور زور زور سے رونے چیخنے لگی۔ کچہری میں عورتوں کی چیخ پکار روز ہی سنی جاتی ہے لیکن اس کی تڑپن میں کچھ جادو تھا کہ راہ چلتوں کے پیر روک لیتا تھا۔ کچہری کا کمرہ بھر گیا۔

www.taemeernews.com

بھولا بیس سال کا ایک چھوٹے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ کالے چہرہ پہ کالی آنکھیں ناگ کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ گجریا کے بین اور رونے کا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس پر کوئی اثر نہ تھا۔ "اے بھولا میں تو کو نہ جانے دوں گی ...... اے جج صاحب ایسا ظلم نہ کرو۔ مو کو بھی سنگ ہی بھیج دو۔ اے سپتیا میں ہا ہا کھاؤں مو کو بھی لے چل۔ یا کے سنگ مو کو بھی بند کر دیجیو"۔

"ہٹ ہٹ۔ چھوڑتی نہیں سسری"۔

"مٹرو۔ پکڑو نہ اس .... کو" .... نے گجب اٹھا رکھا ہے۔"

ادھر اس کے بھائی نے اور تین سپاہیوں نے پکڑا۔ ادھر کانسٹبلوں نے بھولا کو دھکا دیا .... چل بے ...... کھڑا کیا دیکھتا ہے"۔ اس کو گھسیٹ کر کمرے سے لے گئے ..... "بھولا ..... او بھولا ..... کہاں چھوڑ چلا"۔ پیچھے بھاگنے کی کوشش کی لیکن وہ چار مردوں کی آہنی گرفت سے کہاں جا سکتی تھی۔ زمین پر مچل گئی۔ ایڑیاں رگڑنے لگی "بھولا ..... اے بھولا ..... بھولا ..... بھولا ....."

"کورٹ صاحب اس عورت کو باہر نکالو۔ شور نہیں مانگتا ..."

"پیشکار! سرکار بنام بندہ کو آواز لگاؤ"۔

بھولا قوم کا گڈریہ تھا۔ کالسرد کے جنگل میں گائے بیل چرایا کرتا تھا۔ پتلا سا مست آدمی تھا۔ اپنے بھائی بھاوج کے ساتھ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں پھاندو والے میں رہتا تھا۔ بچپن سے اسی جنگل میں رہا پلا بڑھا جنگل میں اس کا من لگتا تھا۔ سونگ ندی میں گاؤں کے اور جوانوں کے ساتھ

www.taemeernews.com

مل کر نہاتا اور پھر اس کی آواز بھی کیا غضب کی تھی۔ اس کا پتوں کے ڈھیر پر لیٹ کر اور لہک لہک کر گانا

"نینوں سے نینا ملا و میری جان" گاؤں کی لڑکیوں کی آنکھوں میں چمک پیدا کر دیتا ہے۔

کانسرو کا جنگل فروخت ہوا اور کئی بڑھئی درختوں کو کاٹنے اور گرانے لگے۔ ان میں سے ایک مٹرو بھی تھا۔ وہ مع اپنی جوان گجریا کے وہاں آیا۔ بڑھئی اپنی عورتوں کو جنگل میں کام پر نہیں لے جاتے ہیں۔ لیکن مٹرو کا چھپا چھاندہ والے میں رہنا تھا۔ لہذا وہ گجریا کو بھی ساتھ ہی لے آیا۔ گجریا سولہ سترہ کی سال گندمی رنگ کی بھرے بھرے جسم کی ایک گرما گرم لڑکی تھی گاؤں کی اور عورتوں کے ساتھ ندی پر پانی بھرنے جاتی تھی۔ راستہ بھر ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ چہلیں کرتی بھاگ دوڑ مچاتی ہوئی جاتی تھی۔ راستہ ادھر سے نکلتا تھا جہاں گاؤں کا ایک آدھ گڈریہ گایوں اور بیلوں کے واسطے چرا رہتا تھا۔ اکثر ان مردوں اور عورتوں میں چھیڑ چھاڑ ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ "تو بڑا جلی ہے رے بھولا" اس کی بھاوج جو بھولا کے مذاقوں کو پسند کرتی تھی بن کر جواب دیتی۔ کوئی لڑکی کہتی۔ "اے بھولا جرا دن ہولی تو ناوے"

"کیا دے گی" بھولا آنکھ مار کر پوچھتا۔

لڑکی اٹھا کر پتھر مارتی۔ "دیکھو بھابی یہ بھولا گاری دیتا ہے۔"

گجریا کے آنے سے بھولا کی زندگی میں بہت تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اب پہلے سے بھی زیادہ گانے لگا۔ اس کے مذاق بھی زیادہ تیکھے ہو گئے تھے۔ وہ گجریا کے انتظار میں بیٹھا رہتا۔ ایک آدھ دفعہ گاؤں کی گلی میں گجریا اس کو اکیلی بھی ملی لیکن گجریا کو دیکھ کر اس کے پیر بندھ جاتے تھے اور منھ تو جیسے کسی نے کیل دیا ہو۔

055
www.taemeernews.com

جب گجریا سامنے نہ ہوتی تو بڑی بڑی باتیں سوچتا لیکن دیکھ کر سب بھول جاتا۔
ایک دن جب وہ جنگل میں گا رہا تھا گجری اور عورتوں کے ساتھ اُدھر سے گزری اس کو دیکھ کر بہت عورتیں رکیں۔ وہ اسی طرح بیٹھا گاتا رہا۔ پھر گجریا کی طرف دیکھا۔ اس نے نیچی نگاہ کر کے مسکرا دیا۔ بھولا گانا وانا سب بھول گیا۔ گجریا اور دوسری عورتیں چلی گئیں۔ لیکن اس دن سے گجریا اور وہ آنکھوں اور مسکراہٹ میں باتیں کرنے لگے۔

ایک دوپہر کو گجریا کا پانی جلدی سے ختم ہو گیا اور اس کو اکیلے جنگل پانی لینے جانا ہوا۔ راستہ میں بھولا مل گیا۔ ہمت کر کے بولا۔ "گوری آج اکیلی اکیلی کہاں؟" گجریا بگڑ گئی۔ یہ ڈر گیا۔ لیکن ہمت کر کے چھیڑتا ہی گیا۔ گجری بھی ہنس دی بھولا نے اٹھ کر اس کی کولی بھر لی۔ وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ لیکن وقت اور جگہ مقرر ہو گئی۔

بھولا کی بے چینی کا عجیب حال تھا۔ تین رات سے اسی جگہ گجریا کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن وہ آئی نہ تھی۔ آخر کو چوڑیاں بھوے اتار کر دبے پاؤں گاؤں کے باہر لکڑیوں کے ڈھیر کے پیچھے آ کر کھڑی ہوئی اور چپکے سے بھولا کو بتایا کہ اس کا میاں سٹر دپورے وقت اس کے ساتھ ہی سوتا رہا۔ وہ کوئی بہانہ نہ لگا سکی۔ اب پیٹ میں درد اور جنگل کا بہانہ کر کے آئی ہے۔ اور بہت جلدی جانا ہے۔ اب یہی قصہ چلنے لگا کہ بھولا رات رات بھر گجریا کے انتظار میں جاگا کرتا اور وہ اگر موقع لگ جاتا تو آ جاتی۔

بھولا اپنی اور سب آشنا عورتوں کو بھول گیا۔ جہاں لگائی ہوئی اس کی بھی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ بھائی کے بہت بگڑنے پر کہہ دیتا "ابھی میں نا کرتا"۔ پریم کی پینگیں بڑھتی گئیں۔ دونوں انجام سے بے خبر جب ہی تک

056
www.taemeernews.com

زندہ رہتے جب تک ایک دوسرے کی آغوش میں ہوتے۔
گاؤں کے آس پاس لکڑی کے ڈھیر لگے تھے۔ ایک رات کچھ لوگ جا رہے تھے حقہ پی رہے تھے کہ گجریا نکلی اور جنگل کی طرف چلی۔
"کون گئی؟" ایک نے شک کے لہجے میں آہستہ سے پوچھا۔
دوسرے نے کہا۔ "مٹرو کی معلوم پڑتی ہے"۔
"یا دکھت وہاں اس کا کیا کام ہے" کہ اتنے میں آہستہ آہستہ بھولا بھی اسی راستے سے جاتا دکھائی دیا۔
"ہوں! تو یہ بات ہے!!
"لو۔ کوا اور بھی کوئی نہ ملا۔ یہ گڈریا کا ہی رہ گیا تھا؟"
گاؤں میں ایسی بات آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ دوسرے روز آہستہ آہستہ ہر طرف اس کا چرچا تھا۔ لیکن مٹرو کے منھ پر کون کہے۔ آخر کو کاشی بڑھئی نے حقہ پیتے پیتے مٹرو کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مٹرو تیری عورت ہے تو بڑی سندری"۔ مٹرو نے غضبناک آنکھیں نکال کر کاشی کی طرف دیکھا۔
"تجھے کا؟"
"نا بھیا میں تو کہتا تھا کسی سندری کا قابو میں رکھنا بڑا مشکل کام ہے کیوں ٹھیک بات ہے نا بلدیوا" بلدیوا نے بھی سر ہلا دیا۔
مٹرو نے بگڑ کر پوچھا "کون کا بات ہے۔"
"کچھ نا بھیا۔ کل رات تیری عورت اُدھر ندی کے جنگل میں جا رہی تھی تھوڑی دیر بعد بھولا بھی اُدھر ہی گیا"
"کون بھولا؟"
"وہی گڈریا کا"

057
www.taemeernews.com

"ہوں"

"نا بھیا کچھ دیکھا دیکھا نا ہیں۔ بس جو بات تھی کہہ دی"۔

مٹرو کے دل میں تو جیسے چھری بھونک دی ہو۔ گھر میں آ کر گجریا کو خوب پیٹا تو دل کچھ ٹھنڈا ہوا۔ لیکن اب ہر وقت وہ گجریا کو آنکھوں میں رکھنے لگا۔ ادرا ادھر اپنی چاچی سے بھی کہہ دیا۔ "چاچی اس کا دھیان رکھنا۔ ادھر اُدھر اکیلی نہ ڈولے"۔

گجریا پر اب بہت سختی ہونے لگی۔ مٹرو بات بے بات مارنے لگا۔ لیکن اس نے بھولا سے ملنا نہ چھوڑا۔ دو ہی منٹ کو مل لیتی گلے ہی لگ آتی۔ ہاتھ ہی چھو لیتی رفتہ رفتہ چاچی بھی بات کو بھولنے لگی اور مٹرو بھی ذرا غافل ہو گیا۔

ایک رات مٹرو کی آنکھ کھلی گجریا غائب تھی۔ چپکے چپکے جھونپڑے میں ڈھونڈھا۔ باہر نکل کر ڈھونڈھا۔ کہیں نہ ملی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ گجریا دبے پاؤں گھر کی طرف جا رہی ہے۔ اور کچھ فاصلے پر بھولا بھی ہے .... بات صاف تھی۔ گجریا کے پیچھے پیچھے گھر چلا اور اس سے پہلے کہ وہ گھر میں گھسے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گجریا کا دم ہی تو نکل گیا۔ لیکن آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی رہی۔ چھ مہینے کی منوا تر محبت نے اس کو تھوڑا سا نڈر بھی کر دیا تھا۔

"کہاں گئی تھی؟"

"جنگل"

"ساتھ کون تھا"۔

گجریا چپ تھی۔

"بولتی کیوں نہیں .....؟" ایک طمانچہ زور کا منہ پر پڑا۔ پھر گھونسہ لات۔ اور گھونسہ لات اور گھونسہ لات! ویسے جب گجریا پٹتی تھی تو گاؤں کی

www.taemeernews.com

اور عورتوں کی طرح وہ کبھی داویلا مچاتی تھی۔ لیکن آج رات وہ مار کھاتی رہی اور جب رہی گھونسوں کی آواز سن کر چیچی نکل آئی۔ مٹرو کو اندر لے گئی۔ گھر والوں میں صلاح ہوئی کہ اپنی عزت کی بات ہے۔ بات دبا دینی چاہیئے اور اس.... کو اس کے باپ کے گھر پہونچا دینا چاہیئے۔

دوسرے روز سوچی سمجھائی گجریا وہاں سے آٹھ میل پر برکوٹ پہونچا دی گئی۔ اور ساتھ ہی مٹرو اس کی ساری بات بھی کھولتا آیا۔ وہاں پر باپ و سوتیلی ماں۔ بھائی اور بھاوج نے ہر وقت کی چوکیداری شروع کر دی لیکن ایک گڈریہ کے لئے آٹھ میل کیا ہوتے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں پیچھے پھر دونوں آنکھوں اور دسویں چھپ کر ملنے لگے۔ ایک روز بھتیجے نے دیکھ لیا۔ آکر گجریا کے بھائی سے کہا۔ بھائی نے مٹرو سے بھی زیادہ بہن کی مرمت کی۔ اور اب گھر والے رات کو اسے کوٹھری میں بند کر دیتے تھے۔ جون کا مہینہ، چھوٹی سی کوٹھری۔ گجریا تنگ آکر وہاں سے ادھ مری ہو کر نکلتی تھی۔ ایک شام کو وہ گھر سے غائب تھی۔ سارا گاؤں، جنگل ڈھونڈھ ڈالا۔ پتہ نہ لگا۔ مٹرو کے پاس آدمی راتوں رات گیا معلوم ہوا کہ دو دن سے کھولا بھی غائب ہے۔ دوسرے دن پولیس میں اطلاع ہوئی۔ وارنٹ کٹوایا کہ کھولا نابالغ لڑکی کو لے کر بھاگ گیا ہے۔ آٹھ روز بعد دونوں پکڑے ہوئے لائے گئے۔ عدالت میں گجریا نے گواہی دی۔ اپنی محبت اور خود اپنی مرضی سے کھولا کے ساتھ جانے کا اقبال کیا۔

کھولا نے بھی بہت کہا کہ مجھ کو اس کی عمر کی کیا خبر تھی کیا اس کے ماتھے پر لکھی ہوئی تھی۔ مجھ کو اس سے محبت ہے۔ یہ خود میرے ساتھ چلی آئی۔ لیکن قانون تو قانون ہی ہے اس میں چوں کی کیا مجال۔

اور پھر جب رائنسن جیسا قابل جج قانون کی ترجمانی کرے تو کھولا کو تین

059 www.taemeernews.com

سال کی سزا سے کیا کم مل سکتی تھی۔

کلب میں آج شام ہر طرف چہل پہل تھی۔ چالیس کے قریب انگریز مرد اور عورت تھے اور تین چار ہندوستانی معہ اپنی بیویوں کے رونق افروز تھے۔ آج رابنسن کی بہت قدر تھی۔ ہر طرف ان کی توجہ تھی۔ ہر انگریز ان کے "ہوم" جانے پر افسوس کر رہا تھا۔ انگریز یہاں خواہ کتنے ہی آرام و آسائش میں رہیں لیکن "ہوم" چھٹی پر جانا ایسا ہی محسوس کرتے ہیں جیسے کوئی چڑیا پنجرے سے چھوٹ کر خوش ہوتی ہے۔ ہندوستان کی قدر تو وہ اکھٹا ہی کرتے ہیں یعنی جب پنشن پاکر عمر بھر کے لیے "ہوم" جاکر ہوم بساتے ہیں۔ آج تو رابنسن اور بھی غیر معمولی طور پر خوش تھا کہ اب وہ شادی کرنے جا رہا تھا۔ ایک میز پر وہ، ٹم راجرس، ایک اور انگریز اور مس فوکس بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"ہاں یہ بات ٹھیک ہے۔ یہ لوگ ہوتے تو "ایموشنل" ہیں بالکل جانوروں کی طرح ہے۔"

"اب دیکھو جیتا نے پر لرڈ کر کیپٹن مارٹن کے بیرا نے چوکیدار کے چھرا بھونک دیا!" مس فوکس نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"روگ (ROGUE) کا مجھ کو وہ آدمی بالکل پسند نہیں تھا۔ نہ معلوم مارٹن نے اس کو کیوں رکھا ہوا تھا۔"

"مجھے تو بہت خوشی ہے کہ میں جا رہا ہوں ورنہ اس کو پھانسی کی سزا بھی مجھی کو دینی پڑتی"۔ رابنسن نے کہا۔

"پھانسی کی سزا مجھ کو بالکل پسند نہیں"۔ ٹم راجرس نے کہا۔ جو ابھی تین مہینے پہلے ہندوستان آیا تھا۔ یہاں کی ہر چیز اس کو ایک عجوبہ معلوم ہوتی تھی۔

www.taemeernews.com

"پھانسی کی سزا پسند نہیں۔" مس فوکس زور سے چیخیں۔ اگر پھانسی کا ڈر نہ ہو تو یہاں کے وحشی "نیٹیوز" ہم میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑیں۔

"ارے چلیے بھی مس فوکس آپ کتنی عجیب باتیں کرتی ہیں۔" ٹم راجرس نے جس پر ابھی تک کیمبرج کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ہنس کر مس فوکس کو چھیڑا۔

"لیکن مارٹن کے بیرا کو تو ضرور پھانسی ملنی چاہیے۔ رات پھر اس چوکیدار کی عورت اتنے زور زور سے روتی رہی ہے کہ مارٹن کے کمپاؤنڈ اور ہمارے کمپاؤنڈ میں کسی کو سونے ہی نہ دیا۔"

"تو بیرا کے پھانسی لگنے سے کیا چوکیدار کی بیوی کا رونا رک جائے گا؟" ٹم نے پھر پوچھا۔

"مسٹر راجرس تم ابھی ابھی ہندوستان آئے ہو تم اپنے جوش میں بہت سی باتیں کہہ جاتے ہو۔ لیکن مس فوکس نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے۔ اگر پھانسی کا ڈر نہ ہو تو اس وحشی ملک میں ہر وقت قتل و خون ہوا کرے۔ ہمارے قانونوں کی برکت سے اتنا ہوا ہے کہ امن و امان قائم ہے۔" جج صاحب نے کہا۔

"ہاں چلیے چلو ...." ٹم راجرس نے کہا۔

"یہ ہمارا ہی بنایا ہوا قانون ہے جس کے سامنے ہر چھوٹا بڑا بغیر کسی قوم و ملت کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ اور جبھی ہر ہندوستانی کہتا ہے کہ اس انگریزی راج میں شیر اور بکری ایک جگہ پانی پی سکتے ہیں۔"

"سچ مچ تو کیا یہاں کا قانون اپنے "ہوم" کے قانون سے مختلف ہے؟" ٹم راجرس نے مسکرا کر سوال کیا۔

اس پر تینوں انگریز جو کئی سالوں سے ہندوستان میں تھے ہنس پڑے۔

061 www.taemeernews.com

ٹم بالکل سرخ ہو گیا۔

مس فوکس نے کہا۔ "ٹم تمھارا مطلب کیا ہے"۔ تمھارے خیال میں ہم میں اور "نیٹیو" میں کچھ فرق ہے"۔

"میرا مطلب یہی ہے کہ قانون ہندوستان میں چھوٹا بڑا یا اونچا نیچا نہیں دیکھتا۔ میں اپنی طرف سے بلکہ سب انگریزوں کی طرف سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے دل میں کبھی ایسے خیالات نہیں آئے۔ ہم تو قانون سب کے لئے برابر سمجھتے ہیں"۔ رابنسن نے کہا۔

اتنے میں سوشیل کمار گپتا ایک ہندوستانی آئی۔ سی۔ ایس بھی اس گروپ کے قریب آ نکلے اور ہیلو رابنسن کہہ کر میز کی طرف بڑھے۔

"دیکھو گپتا آپ نے مجھے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا تھا اور خود جلدی چلے گئے"۔ راجرس نے شکایت کی۔

"میں بہت سویرے گیا تھا اور پھر میری فیملی بھی ساتھ تھی۔ افسوس کہ آپ کو ساتھ نہ لے جا سکا۔ لیکن مجھ کو دو تین روز بعد پھر جانا ہے"۔

"آپ کہاں گئے تھے؟" رابنسن نے پوچھا۔

"کانسراؤ کی طرف۔ ہاں وہاں ایک گاؤں ہے پھاندو والا۔ وہاں پرکل ایک عجیب واقعہ ہوا (ہنس کر) اس کے ذمہ دار رابنسن تم بھی ہو"۔

"میں" رابنسن نے حیران ہو کر پوچھا۔

"کیا ہوا" مس فوکس نے سوال کیا۔

"ایک جوان لڑکی نے اپنے شوہر کے گھر کو آگ لگا دی اور پھر اپنے کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ میں گھس گئی"۔

"تو میں کس طرح ذمہ دار ہوا؟ رابنسن نے مسکرا کر پوچھا۔

062
www.taemeernews.com

"تم نے دو عاشق و معشوق کو جدا کر دیا۔ آدمی کو جیل بھجوا دیا لڑکی خود جل مری۔ گھر بھی ساتھ پھونک گئی۔"

"کون سا کیس" رابنسن نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"کہانی مجھ کو معلوم ہے۔ کیس کی مجھ کو خبر نہیں۔" گپتا نے کہا۔

"مسٹر گپتا ضرور ساری بات سنائیے۔" مس فوکس نے اشتیاق سے پوچھا۔

گپتا نے کہا کہ "مس فوکس کہانی دلچسپ ہے۔ ایک بڑھئی کی عورت کا ایک گڈریے سے عشق تھا۔ جب بڑھئی کو خبر لگی تو اس نے مارا پیٹا کچھ نہ ہوا۔ دونوں ملتے رہے۔ لوگ تو کہہ رہے تھے کہ دونوں نہ چیتے سے ڈرتے تھے نہ شیر سے۔ اور چھپ چھپ کر راتوں کو جنگلوں میں ملتے تھے۔ پھر بڑھئی نے اس کو اس کے باپ کے یہاں بھیج دیا۔ وہاں اس کے رشتہ داروں نے مارا پیٹا۔ نہ کیا۔ لیکن پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر چھپ چھپ کر راتوں کو جنگل میں ملتے رہے۔ آخر وہ ایک دن اس لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہر دوار سے دونوں پکڑے آئے۔ نمبر ایک مقدمہ قائم ہوا۔ رابنسن صاحب کے ہاں لڑکا ضمانت پر چھوڑ دیا گیا۔ ان دونوں نے پھر چھپ کر ملنا شروع کیا اور پھر بھاگ گئے۔ اب کے بمبئی جا رہے تھے کہ دہلی پکڑے گئے۔ اب دو مقدمے قائم ہو گئے۔ ہمارے رابنسن نے لڑکے کو تین سال کی قید کر دی۔"

اچھا ہندوستان میں بھی لوگ محبت کرتے ہیں؟" مس فوکس نے نہایت تعجب سے پوچھا۔ گپتا اور ٹم قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

"قانون ہے جناب میں کیا کروں۔" رابنسن نے تھوڑی دیر بعد

063 www.taemeernews.com

جواب دیا۔

"اوہ جارج!" مس فوکس نے تین سال کی نا امیدی کا بدلہ اپنی آواز میں بھر دیا۔ رابنسن مطلب سمجھ کر سرخ ہو گیا۔

"میری بات ٹھیک ہے نا۔ رابنسن اگر گیتا کی عورت کو لے کر بھاگ جائے تو تم یہی سزا دیتے؟"

"میرا نام کیوں لیتے ہو میری بیوی تو قریب ہی بیٹھی ہے۔ اپنا ذکر کرو۔"

"اچھا میرا ہی سہی۔ اچھا سچ بتاؤ رابنسن اگر تم اس مرد کی جگہ ہوتا تو تم یہی سزا دیتے (ٹھہر کر) اور جو فرض کرو تم اس کی جگہ ہوتے تو تم کیا میرے سے یہ امید کرتے کہ میں تم کو یہی سزا دوں"

مسٹر راجرس نے جو رابنسن کی عشقیہ ہسٹری سے بالکل ناواقف تھا۔ یہ سوال کیا۔

"تمہارے سوال کا جواب ...."

مس فوکس نے بات کاٹ کر اس کو ایک 'نیٹیو' کے سامنے بڑھنے نہ دیا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

(۱۹۴۱ء)

064 www.taemeernews.com

چھدّا کی ماں

اس سال میں اپنے ماموں کے ہاں گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے گئی تھی۔ ان کے سائیس کی ماں جس کو ہم سب "چھدّا کی ماں" کہتے تھے۔ پنکھا جھلنے پر نوکر تھی۔ وہ پنکھا جھلتی رہتی تھی۔ اور باتیں کرتی جاتی تھی۔ ایک دن وہ ممانی جان سے کہنے لگی۔ "حجور چھدّا کو چار دن کی چھٹی دے دو۔ وہ گام جانے کے رہو ہے"۔

"ابھی تو گیا تھا۔ اب روز روز کی چھٹی!" ممانی جان جو آدھی سو چکی تھیں۔ بگڑ کر بولیں۔ "کیوں جا رہا ہے؟"

"اے اب کا بتاؤں حجور۔ میرا چھوٹا دیور آیو ہے۔ وہ کہت ہے۔ چھجو کی بیواہ کو گھر میں ڈال لیو۔ گھر کی مٹی (عورت) گھر میں رہے تو اچھو ہے"۔

"اب کتنی جور دیسیہ چھدّا گھر میں ڈالے گا!"

065 www.taemeernews.com

"یا میں چھدا کا کاہا دوس ہے۔ واکی تکدیر ہی کھراب ہے۔ اب پچھلی تو سُتری ....."

"تیرے لئے تو سب کی سب خراب ہیں۔ جو بہو آتی ہے کیڑے ڈالتی ہے۔ کسی بہو کو نہیں ٹکنے دیتی"۔ ممانی جان نے کہا۔ "جا چھٹی۔ اوٹی کچھ نہیں ملتی۔

چھدا کی ماں چپ ہوگئی۔ لیکن پھر جب ممانی جان آنکھیں بند کرنے لگیں تو بولی "بیگم صاحب سانچی کہوں ہوں۔ وہ داری تو ٹٹ جاکر ہاتھ تلک نا ہیں دھوئے تھی۔ دس بیر تو میں نے واکو مارا ہوگا"

"اور سو دفعہ بیٹے سے پٹوایا ہوگا"

"اے نا بیگم صاحب!" چھدا کی ماں نے اٹھلا کر جواب دیا۔ جب وہ ایسے بولتی تھی تو تین پیلے پیلے دانت باہر نکل پڑتے تھے۔ اور اس کا بدشکل چہرہ اور بھی زیادہ ڈراؤنا ہو جاتا تھا۔

"اور اس اگلاس والی میں کیا برائی تھی؟ ایسا پیارا پیارا چہرہ تھا نگوڑی کا۔"

"کینٹا تو تھی ہی بیگم صاحب! رات کو واکی باؤں دیکھ کے ڈر لگے ہا"

"ہاں تو تو بڑی سندر پری ہے۔ اپنی صورت کبھی آئینہ میں دیکھی ہے چڑیل!" ممانی جان ہنس پڑیں۔ "خود تو بالکل بھتنی کی صورت ہے۔ بچے تک دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔ لگی ہے دوسروں کی صورت کو برا کہنے! سچ کہتی ہوں عائشہ ایسا بھولا بھولا منہ تھا اس بچاری کا۔"

بڑھیا ہنسی اور پنکھے کا ہاتھ بدل کر بولی۔ "اے تو جور! بہو کی صورت دیکھی جائے ہے یا واکے گن۔ جا لگائی کے بچہ نہ ہو دار کھ کے کاہا

www.taemeernews.com

ٹھلوا کھلانا ہے۔ لگائی جب پیاری جب للا جنے اور بھینس جب پیاری جب پڑیا جنے"۔

"کل تیرا مہینے تو وہ بچاری تیرے گھر رہی اور بچہ کا ہے کو ہاتھی ہو جاتا۔ چل اب سونے دے مجھے!"

چھدا کی ماں اپنی بات پر اڑی رہی اور بولی "تو حضور کل چھدا چلا جائے نا؟"

ممانی جان اٹھ بیٹھیں صراحی میں سے پانی نکال کر پیا اور پھر لیٹ کر بولیں۔ "پچھلے چند سال میں آٹھ دس بیاہ تو تو چھدا کے رچا چکی ہے۔ ہر کسی میں عیب نکال دیتی ہے۔ تیرا بس چلے تو تو بہو لائے ہی نا۔ برادری کے ڈر سے تو آتی ہے۔ پر کسی بدنصیب کو ٹکنے نہیں دیتی۔ سوکنوں سے زیادہ جلتی ہے"۔ بگڑ کر: "آخر معاملہ کیا ہے۔۔۔۔۔ کان کھول کر سن لے اور چھدا کو بھی سنا دیجیو کہ جو اس بار عورت کو چھوڑا تو میں کھڑے کھڑے گھر سے نکال دوں گی۔

بڑھیا نے پھر ہاتھ بدلا اور اٹھلا کر بولی۔ "واہ واہ بیگم صاحب کہیں بہوؤں کے پیچھے اپنے اینو چھوڑ دوچھوڑ دیو گی۔ چھدا تیارو اینو چھوڑا ہے جیسے یا کے باپ نے مر کر تیارا دلی چھوڑی ویسے ای یہ بی چھوڑے گو۔

ممانی جان خوش ہو گئیں اور آنکھوں پر سے ہاتھ اٹھا کر بولیں۔

"تو پھر کب جائے گا؟"

بڑھیا نے بازی جیت کر کہا۔ "جب تمھارو حکم ہوئے گو۔"

"کل تو بھائی جان آ رہے ہیں۔ گاڑی چاہیے ہوگی۔ پرسوں چلا جائے۔ چھٹی دو روز سے زیادہ نہیں مل سکتی۔ زیادہ دن لگائے تو تنخواہ کاٹ لوں گی۔ ہر دفعہ کا یہ قصہ مجھ کو پسند نہیں۔ نہ معلوم کتنی عورتیں

www.taemeernews.com

کرچکا ہے اور تو کٹنی کسی کو نہیں ٹکنے دیتی۔ چھدا تو مٹی کی مینا ہے۔ جو یہ چڑیل کہتی ہے وہی کرتا ہے ...."

بڑھیا کھول گئی اور بولی "اے ناجور۔ بھلی جو یا ہتا ای۔ کنبھٹی! وہ بڑھے نا ہی! واکے سنگ کی چھوریوں کی گود میں دو دو پوتے اور وہ کے میری سوت کے جو ہے کا بچہ کبھی نا ہیں۔"

اسی کم بخت کا تو تجھ پہ صبر پڑا ہے۔ اچھا ہوا تیرے ہاں چوری ہوگئی۔ اس بچاری کو تو تو نے وہ دہ مارا ہے۔"

"بن سانچی کہوں بیگم صاحب واکو تو میں کچھو نا نکالتی۔ واکے باپ نے بڑد دھو کو کیو ہم تیئں۔ سا دن کو لیو اسے لے گیو۔ پھر بھیجی۔ ایں ناہیں او۔ دوسری جگہ بٹھائے دئی۔"

"اچھا کیا! تجھ سے تو بچی۔ نرنیا کی بہو کہہ رہی تھی کہ اب تو اس کی گود میں لونڈا ہے۔" ممانی جان نے کہا۔

"واری یہ کے راج گھاٹ کے میلا میں ملی ہی۔ موکو دیکھ کے اپنے منھ کو پھیر لیو۔ میں تو واکو اور واکے باپ کو کیدکٹا دیتی۔ پر واکے کراؤ نے ڈیڑھ سو روپیہ دیو۔ تب کہیں جائے کے باپ کو ہکو پانی کھولو۔ ہنسی کھیل تھوڑی رہا۔"

"وہ جو تھی کیا نام تھا اس کا؟ جو خوب لمبی سی تھی"۔

"وہ!! اے مجبور واکو تو نام او نہ لو۔ وئی نے تو آتے ہی چھدا کے باپ کو ڈس لیو"۔

"کیوں! کیا وہ سانپ تھی؟" میں بغیر بولے نہ رہ سکی۔

"اے بی بی سانپ کے کاٹے کا تو منتر ہے۔ پر ڈائن کو نا ہیں۔

www.taemeernews.com

"کیسے ڈس لیا اس نے؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اے بی بی تم کا جانو یہ باتیں! تم مدرسے میں پڑھتو۔ وہ تو چڑیل ہی چڑیل۔ والکے آنے کے تین ہی دن بعد چھیدا کے باپ کو ایسو بکھار چڑھو کہ پھیر اتر دہی نا۔ تین اٹھوار دل میں چل بسو۔" چھیدا کی ماں نے بسورتے ہوئے اور آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"چل چڑیل کہیں کی!" ممانی جان آدھی نیند میں بولیں۔

"جو وانے نائے ڈسو تو ایسے ای مر گیو؟ جائی وکھت وہ چوکھٹ چڑھی وائی وکھت دن کے موڑ میں دد ہیو۔ دو تین دنا تو پڑے چھٹپٹات رہے۔ پھیر بکھار چڑھ آیو۔ کوئی حکمت نائے اترو۔ سب جتن کیو۔ بیگم صاحب نے سپتا کھانے کے ڈاگدر صاحب کو بھی دکھایو۔ پیر کا کوئی سیانو ناہیں چھوڑو۔ جو آیو یہی کہت آیو کوئی ڈائن چپٹ گئی ہے"۔

"چل بڑھیا۔ ڈائن ایسی ہوتو تو نہیں ہیں! کھاتی تو تجھے کھاتی۔ اس بچارے کو کھا کر کیا فائدہ تھا اس کو تو میعادی بخار تھا۔ کتنا میں نے ان کم بختوں سے کہا کہ اسپتال لے جاؤ۔ لیکن تم لوگ کبھی کسی کی سنتے ہو؟ میعادی بخار تھا اور کیا تھا"۔

"نا بیگم صاحب، تم بڑی آدمن ہو۔ حاکم ہو جو کہو ٹھیک ہے۔ پر سانچی کہوں ان کو میعادی بکھار نا ہیو۔ ان کو تو وہی ڈائن ڈس گئی ——" ٹھنڈی سانس بھر کر پھر سے بولی۔ "اے بی بی تم لوگ یہ باتیں کا جانو جب بکھار اترو ہی نا۔ اور حکیما نے ان نے پوچھیں کہ تو کو کچھ دیکھے پڑتو ہے۔ تو وہ بتلائیں۔ کچھ نائے دکھتا۔ ایسی چھلمی ڈائن ہی کہ دن کو منھ بھی پھیل دیو پچھلے تین چار دنا میں تو جے حال ہے گیو۔ کہ جب وہ واری کو کھڑیا میں گھسے

www.taemeernews.com

اور وہ چیکیں اور کھٹیا پر سے اٹھ کے بھاگیں جو وہ چلی جائے تو چپ چاپ پڑ جائیں۔ میں کا جانوں۔ میں کہوں اری۔ ری بہو ذرا نیک وہ دودھ اٹھائے لا۔ جوں ہی وہ اکھاگن دودھ کا کٹورا لائے، وہ ایسو ایک ہاتھ ماریں کہ دودھ جا کے پڑے۔ جو میں دیوں تو چپ چاپ پی لیں اور جو اُو پانی بھی دے تو چیکھ پڑیں۔ ڈر جائیں۔ اور بی بی کا کہوں۔ چھدا پہ تو میری سوت نے ایسو جادو کیو کہ واکو تو بس اندھو ہی کر دیو۔ پھرو کھٹ واہی کی مالا جپن لگو۔ میں کہوں ایک کو تو کھائے گئی۔ اب کس کس کو اور ڈسے گی"۔ موکو راتوں نیند نہ آئے۔ پھر میں چپکے سے چھدا سے بے تبلائے مٹرو کے دھورے گئی۔ بڑا ہی سیانا سیانو ہے۔ میں وا کے پاؤں پہ گری اور کہن لگا میرے چھورا کی جان بچائے۔ میں تیرو بڑو گن مانوں گی۔ ایک روپیہ تو وانے وہیں دکھنت لے لیو۔ میں نے کہیں جائے ڈائن اسے ڈائن گھر سے نکلے گی۔ وای ڈائن تو کو ایک اور دیوں گی۔"

"تو پھر کیسے نکالا تو نے؟" میں نے پوچھا۔

"بڑے بڑے جتن کیئے۔ بڑی مشکل تے چھدا کو اکیں آیو۔ وا کا نام لے لے کر موسے اب بھی۔ لڑنے بیٹھو جات ہے۔"

"آخر کیا جتن کیئے تھے؟ میں نے پہلے کبھی ایسی باتیں نہ سنی تھیں۔ میرے لئے تو بڑھیا کی باتیں الف لیلیٰ کی کہانیاں تھیں۔

"اے بی بی اب کا بتاؤں"۔

"اری بتانا۔" میں نے خوشامد کی۔

"جو جو مٹرو نے بتایو وہی کیو۔ اور کا کرتی"۔ چھدا کی ماں نے بڑبڑایا۔

"آخر مٹرو نے کیا کہا تھا؟" میں بھی پیچھے پڑ گئی۔

070 www.taemeernews.com

بڑھیا ہنسی اور بولی۔ "بڑے شاہ کے مجار پہ دونا چڑھوائے۔ وانے ایک سرمہ بھی دیو کہ چھدا کے بے تبلائے لگائے دیجیو۔ پھر چھدا کو ڈائین اصلی روپ میں دیکھنے لگے گی۔"

"وہ سرمہ کلتی سے ڈائین نے لگائے لیو اور چھدا وا پہ اور دیوانہ ہوگیو لگو آٹا موکو مارنے۔ میں پھر مسٹر کے پاس گئی تو وہ بولو۔ یہ سالی سیدھے سیدھے نائے جائے گی۔ ایک پڑیا ان نے موکو دی اور کہن کہ چپکے سے چھدا کو کھلائے دیجیو۔ اے بی بی وا پڑیا کا کھانکیں کہ چھدا کے پیٹ میں درد اٹھو اور کھون کی کے ہونے لگی۔ مسٹر ونے موکو جھنجھن کی گڑیا بھی دی۔ وا گڑیا کے چاروں اور سوئیاں چھدی رہیں۔ مسٹر ونے کہن آنکھ بچا کر رکھ دیجیو۔ اور پھر ٹھیکرے ذرا ہلا بجائے دیو۔ پھر دیکھیو سسری کیسے تائیں ٹھیٹری ہے۔ چھدا کو خوب بخار چڑھ گیو۔ اور کے یہ کے ہونے لگی۔ میں نے گھر میں گھس کر کٹھوا ہلا بجا لیو۔ لوگو دیکھو ڈائین جادوگرنی ہے۔ ایک کو تو کھائے گئی۔ اب دوسرے کو بھی لے چلی۔ آپ کے بیڑے کے سب نوکر آئے گئے۔ سب کھڑے کھڑے وا گڑیا دیکھیں اور چھدا سے کہیں۔ بیٹا ایسی عورت کو گھر میں نائے رکھ۔"

"وا دکھت تو چھدا بھی ڈر گیو اور اپنے چاچا کے سنگ واہی دم میری سوت کو واکے پیہر لوٹا دیو۔"

"ذرا سنیں عائشہ اس کی باتیں! اول نمبر کی بدمعاش ہے! خود اپنے ہاتھ سے بیٹے کو زہر دیا۔ اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ وہ تو تمھارے ماموں جان نے دھمکی دی کہ بلاتا ہوں پولیس کو۔ جب کہیں یہ شفا خانے لے گئی تھی۔"

"دو اٹھوارے وہاں رہا۔ سانچی کہوں بی بی سچا کھانے چھدا پورے

071 www.taemeernews.com

پندرہ دِنا رہا۔" چھدّا کی ماں نے اس طرح کہا کہ جیسے چھدا دو ہفتہ قبر میں رہا ہو۔

"مرنے میں کسر کیا رہ گئی تھی۔ وہ تو کہو تمھارے ماموں جان کی بھاگ دوڑ نے بچا لیا۔"

"نائیں بیگم صاحب۔ مرتو تو کیسے! موکو تو مٹر دنے پہلے ری بتا دیو ہو۔" بڑھیا نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"اچھا ٹھہر، تو کم بخت جو آج ہی میں نے چھدّا سے نہ کہا ہو تو مجھ کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ تجھ بدذات نے اس کو زہر دیا تھا۔" ممانی جان جو اپنے نوکروں کی زندگی میں پورا دخل رکھتی تھیں۔ بگڑ کر بولیں۔

"بڑھیا ہنسی۔" چھدّا کو تو بیگم صاحب کچھ دن پہلے ہی مالوم ہے گیو او۔ واتے تو موکو ایک دِنا کھوب مارا کبھی ہا۔ اور پھر کہا گو بھاگو گیو وائے کو لینے۔ تب نا یئں وہ دوسرے گھر بیٹھ چکی ہی۔"

"اب بتاؤ۔ ڈائن یہ کم بخت ہے یا وہ نگوڑی تھی؟" ممانی جان نے مجھ سے پوچھا۔

"سانچی کہوں بیگم صاحب، یہ بتارو چھدّا کے پیچھے بہت ڈولو۔ واکے "یاروں گیو۔ واسے ملیو۔ واکے کراؤ کو روپیہ پیسا دینے کو راجی ہویو۔ پر وہی داری نہ آئی۔۔۔۔۔ واکے پیچھے تو مو سے اب کبھی اڑ بیٹھے تے۔۔۔۔۔ میں نے تو کہہ دیا بھیا چاہے موکو مار چاہے کاٹ پر میں اس ڈائن کو تیرے سنگ نہ رہنے دوں گی۔"

"لیکن وہ ڈائن کیسے ہو گئی۔ میری سمجھ میں تو اب تک یہ بات آئی نہیں۔" میں نے پوچھا۔

072
www.taemeernews.com

"تم نا سمجھ سکو ہو۔ بی بی وہ تھی ہی ڈائن"۔
"آخر کیسے؟"
"ارے اس جاہل سے کیوں بحث کر کے اپنا دماغ خالی کرتی ہو۔ چلو اب سو جاؤ۔ پھر شام کو اٹھنے میں کسمساتی ہو۔" ممانی جان نے مجھے ڈانٹا۔
چار دن بعد چھدا کی نئی بہو آ گئی۔ اچھا بھرا بھرا جسم تھا۔ گو چیچک کے داغ منہ پر تھے۔ پر تھی بڑی ہنس مکھ۔ جس دن وہ آئی اسی دن چھدا کی ماں اس کو ممانی جان کے پاس سلام کرنے کو لائی۔ ممانی جان نے ایک روپیہ بہو کو دیتے ہوئے کہا۔ "سال میں جس کی تین بہوئیں آئیں کہاں تک منہ دکھائی دوں۔ میرا تو دیوالہ پٹا جا رہا ہے۔ کم بخت اب اس کو تو چین سے رہنے دیجیو۔
"اوں ہوں۔ سنیں بیگم صاحب کی باتیں! میں نکالوں ہوں یا ان کے کرم؟"
اب چھدا کی بہو دوپہر کو بجائے اپنی ساس کے پنکھا جھلا کرتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے عجیب جوڑ تھے۔ ایک دوسرے کی دنیا سے قطعی ناواقف۔ وہ مجھ سے کالج کے حالات سن کر تعجب کرتی تھی۔ اور میں اس کی گاؤں کی زندگی کی باتیں سن کر حیران ہو جاتی تھی۔ ہندوستان میں رہ کر میں اپنے ملک سے کتنی انجان تھی۔ اس کا اندازہ مجھ کو چھدا کی بہو سے مل کر ہوا۔ میں اور وہ دونوں دوپہر بھر کھسر پھسر باتیں کرتے اور ممانی جان کو سونے نہ دیتے تھے اور وہ آدھی نیند میں ہوں ہوں سونے بھی دو کہہ دیتیں۔ تو چند منٹ کو ہم خاموش ہو جاتے۔ اور پھر باتیں شروع کر دیتے۔
مجھے اس کی باتوں میں بہت ہی لطف آتا تھا۔ ایک دن وہ آئی۔ اس

073 www.taemeernews.com

کی آنکھیں لال اور منہ سوجا ہوا تھا۔ چوڑیاں ٹوٹی ہوئی۔ بانہہ پر کئی جگہ
خون جما سا تھا۔ میرے پوچھنے پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بتایا کہ چھدا
نے اس کو مارا ہے۔ بڑھیا نے کئی دن سے ہر وقت چیخنا شروع کر دیا تھا۔ اور
ہر وقت اس کی برائی اپنے لڑکے سے کرنے لگی تھی۔ کبھی پکی پکائی دال میں نمک
جھونک دیتی۔ کبھی روٹیوں پر جھوٹے ہاتھ ڈال دیتی۔ کبھی کچھ کام بگاڑ دیتی
کبھی کچھ۔ جب لڑکے نے کچھ نہ کہا تو آج اس نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا۔ جیسے
ہی چھدا گھر میں گھسنے لگا تو بڑھیا نے بہو کو پیٹنا شروع کیا۔ اور کہنے لگی کہ
"یہ چھنال ...... عیدو سے ہنس رہی تھی" اس بات پر چھدا نے بھی نئی
نئی بہو کو خوب پیٹا۔

چھدا کی بہو بہت دیر تک روتی رہی۔ اس کے بعد دو چار روز تک
چپ چاپ سی رہی۔ لیکن ایک خوشی جو بیوگی کے سوگ کو اتار کر نئے بیاہ
نے پھر سے زندہ کر دی تھی اور جس کی وجہ سے ہر وقت مسکراہٹ اور
ہنسی چہرے پر رہتی تھی۔ اس واقعہ کے بعد ایک دم سے غائب ہو گئی۔ ساس
کو دیکھتے ہی سہم جاتی اور منہ فق پڑ جاتا۔ روز روز نئی نئی باتیں اس چالاکی
سے کھڑی کر دیتی کہ چھدا ان پر یقین لے آتا اور نئی بہو کی خوب مرمت کرتا۔
کالج کھلنے پر میں گھر چلی آئی۔ چھدا اس کی ماں اور بہو کو بالکل بھول
گئی۔ ممانی جان سے بھی ایک عرصہ تک ملاقات نہ ہو سکی۔ بھائی صاحب کی
شادی ہوئی تو ممانی جان ہمارے ہاں آئیں اور ایک دن یوں ہی ایک دم سے
مجھے چھدا کی بہو کی یاد آگئی اور میں نے پوچھا کہ "اس کی بہو کیسی ہے۔"
اس پر ممانی جان ہنس پڑیں اور بولیں "وہ! اس کو تو چھدا نے بیچ
بھی ڈالا۔"

www.taemeernews.com

میرے اس کہنے پر کہ ممانی جان آپ کیوں ایسے آدمی کو اپنے ہاں رکھتی ہیں ۔ انھوں نے جواب دیا ۔ "بیٹی کس کس کو نکالوں، دھوبی ہے وہ کئی بدل چکا ہے ۔ مالی ہے اس کی یہی حالت ہے ۔ عیدو بھی دو کو طلاق دے چکا ہے ان کم بختوں کے ہاں اس بات کو کوئی برا ہی نہیں سمجھتا ۔ عورتیں ہی اس ملک میں اتنی سستی مل جائیں تو میں کیا کروں ۔ چھیدا پیدا ہی گھر پر ہوا ہے ۔ اور یہ پھر سائیس اچھا ہے ۔"

میں نے پوچھا کہ اس کی ڈائن ماں کیسی ہے ۔ زندہ ہے یا مر گئی تو انھوں نے بتایا ۔ "ارے وہ کہاں مرے گی ۔ ہاں اب جو یہ نئی بہو آئی ہے اس نے بڑھیا کا دماغ ٹھکانے لگا دیا ہے ۔"

"بڑھیا نے اپنی وہی حرکتیں شروع کی تھیں لیکن یہ لڑکی بڑھیا کے جوڑ کی ہے ۔ ایک دن بگڑ کر ساس کی وہ مرمت کی کہ سب بہوؤں کا بدلہ نکال لیا ۔ اور کہنے لگی بس یہ دیکھ چھوڑ کر نا ہے جاؤں گی ۔ وہ اور ہی رہی ہوں گی جو نا جانے وہ کس کی دھی بیٹیاں تھیں جو چلی چلی گئیں ۔ جو تجھے اس گھر میں رہنا ہے ۔ تو ٹھیک سے رہ ورنہ جا اپنا راستہ پکڑ ...."

"تین دن تک میرے یہاں پڑی رہی ۔ جو جو جادو ٹوٹکے کر سکتی تھی کیے اب رہتی ہے بھیگی بلی بنی ہوئی اور بہو سے ایسا ڈرتی ہے کہ کبھی کبھی تو مجھ کو بھی ترس آ جاتا ہے ۔"

"اور چھیدا"

"وہ تو اس بیوی کا غلام ہو گیا ہے ۔ یہی تو بڑھیا سے دیکھا نہیں جاتا ۔ لیکن بیٹی اصل بات تو یہ ہے کہ عورت عورت میں فرق ہوتا ہے ۔"

(سنہ ۱۹۴۲ء)

www.taemeernews.com

فیصلہ

صفیہ ابھی چھوٹی ہی تھی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے باپ سب جج تھے۔ اور جوان ہی مر گئے تھے۔ لہٰذا روپیہ پیسہ بھی تھوڑا سا جمع ہو سکا تھا۔ چار بچوں کو لے کر صفیہ کی ماں پچیس سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں تھیں۔ صفیہ کی عمر اس وقت چھ برس کی تھی۔ باپ کی یاد تو اس کو کیا ہوتی۔ ایک تصویر خواب کی طرح کبھی کبھی آنکھوں میں آ جاتی تھی۔ صفیہ سے چھوٹی تین بہنیں تھیں۔ اور سب میں چھوٹا لڑکا تو گود ہی میں تھا کہ بیچاری پر یہ مصیبت ٹوٹ پڑی۔ میاں کی موت کے بعد صفیہ کی ماں چار بچوں کو لے کر میکے چلی آئیں اور وہاں بھائی کے قریب ایک چھوٹا سا مکان لے کر رہنے لگیں۔ اپنی غریبی کی کا احساس ان کو ہر منٹ رہنے لگا۔ اگر آج پڑھی لکھی ہوتیں تو اس مصیبت میں کتنا کام آتا۔ انھوں نے ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے اپنی لڑکیوں کو ضرور پڑھوائیں گی۔ سارے کنبہ نے مخالفت کی۔ لیکن انھوں نے

076 www.taemeernews.com

ایک نہ مانی۔ اور پاس کے مشن اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانا شروع کیا۔ لڑکیاں سب ہوشیار تھیں سال بہ سال اچھی طرح پاس ہوتی تھیں۔ صفیہ تو بس کتاب کا کیڑا بنی رہتی تھی۔ ماں کی تمنا تھی کہ میری سب لڑکیاں کم از کم بی اے کریں۔ شہر میں ہندو لڑکیوں کا انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ جب صفیہ نے میٹرک کر لیا تو اس کو انھوں نے وہاں بھیجنا شروع کر دیا۔ ابھی صفیہ نے ایف اے کا امتحان نہ دیا تھا کہ اس کے ماموں کے ایک دوست کے لڑکے کا پیغام ان کی لڑکی کے لئے آیا۔ لڑکا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ خاندان بھی کھاتا پیتا تھا۔ ماموں اپنی لڑکی کی منگنی کر چکے تھے۔ لہذا بہن سے کہا کہ لڑکا اچھا ہے اگر تمھاری مرضی ہو تو میں صفیہ کے لئے کوشش کروں۔ بہن کو بیٹی کے بی اے کرانے کی دھن لگ رہی تھی۔ انکار کرنے لگیں۔ لیکن بھائی بھاوج اور دوسرے رشتہ دار پیچھے پڑ گئے کہ کیا غضب کرتی ہو۔ ایسا لڑکا کہاں ملا جاتا ہے۔ تمھارے سر پر ہاتھ رکھنے والا ہو جائے گا۔ ایک لڑکی کی اچھی جگہ ہو جائے تو دوسروں کے لئے بھی راستہ کھل جاتا ہے۔ تمھارے تین تین تو بیٹیاں ہیں۔ کچھ تو عقل سے کام لو۔ خود تو اولاد کے ساتھ دشمنی نہ کرو۔ لڑکی اٹھارہ سال کی ہو گئی۔ اور پڑھ بھی گئی ہے۔ اللہ نہ کرے اب سب ہی پر برا وقت تھوڑی آتا ہے۔ جب میاں اچھا نوکر ہو گا تو پھر اس کو کیا نوکری کرنی پڑے گی"۔ سب لوگوں نے سمجھا بجھا کر صفیہ کی ماں کو راضی کر لیا۔ اور منگنی ہو گئی ادھر ایف اے کا امتحان اس نے دیا۔ ادھر اس کی شادی ہو گئی۔ حسن مرزا صورت و شکل کے ذرا اچھے آدمی تھے۔ ساتھ ہی خوش مزاج تھے۔ جو ملتا گرویدہ ہو جاتا۔

صفیہ تو انجان لڑکی تھی۔ مرزا اس کے خالی دل پر ہر طرف چھا گئے۔

077 www.taemeernews.com

مرزا بھی اس کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ صفیہ جس نے کبھی آدمی کی جھلک بھی نہ دیکھی تھی اور اس کے سامنے صرف آدمی کا معیار کتابی تھا بہت ہی خوش ہو گئی۔ اس نے جین آسٹن کے ناولوں کا مطالعہ کیا تھا۔ وہ مسز ہنری وڈ کے ناولوں کی ماہر تھی۔ شارلٹ برنٹی کو بھی پڑھا تھا۔ جس طرح ان سب عورتوں کے ہیرو لمبے۔ خوبصورت۔ بہادر۔ ایماندار سچ بولنے والے اور مضبوط جسم کے ہوا نہیں مضبوط کیریکٹر کے تھے۔ اسی طرح صفیہ کا دماغی مرد بھی تھا۔ اور اس نے شادی کے بعد یہ سب صفتیں حسن مرزا میں پائیں۔ اور جو موجود نہ تھیں وہ اس نے اپنی طرف سے پوری کر لیں اور حسن مرزا کو ایک جیتی جاگتی تصویر ہر خوبی کی سمجھ لیا۔

چند روز بعد ہی ایک کمی جو اس نے اپنے میاں میں محسوس کی جس سے اس کو بہت رنج ہوا وہ یہ تھی کہ حسن مرزا اس کے خط کھول کر پڑھ لیتے تھے۔ اس کی پرنسپل مس مارٹن نے صفیہ کو بتایا تھا کہ یہ بہت ہی کمینی حرکت ہے۔ اور کوئی انسان یہ بات کرے تو وہ شرافت کے معیار سے گر جاتا ہے۔ شروع شروع میں تو وہ چپ رہی۔ پھر جب ہر دفعہ ہی یہ بات دیکھی تو ایک دن کہنے لگی "حسن آپ میرے خط کھول لیتے ہیں۔ اچھا کرتے ہیں۔ لیکن اگر مجھ سے پوچھ کر کھولتے تو اجازت تو میں بھی دے دیتی۔ آپ خود ہی اس دن کہہ رہے تھے کہ عورت کو اپنی شخصیت الگ ہے۔ کم از کم مجھ کو تو یہ عادت عجیب لگتی ہے۔ کبھی اماں نے بھی میرے خط نہیں کھولے۔"

بیوی کا سنجیدہ چہرہ دیکھ کر حسن مرزا سیریس ہو گئے۔ انھوں نے کسی بری نیت سے خط نہ کھولے تھے۔ ایک ہندوستانی عادت ان میں تھی کہ کسی

078

www.taemeernews.com

کے خط پڑھ لینے کو وہ برا خیال نہ کرتے تھے۔ ان کے خاندان میں تو کوئی خط پرائیویٹ ہوتا نہیں تھا۔ ان کے چچا نے ایک دفعہ بھتیجی کا خط جو اس نے اپنے میاں کو لکھا تھا کھول کر پڑھ لیا تھا اور پھر وہ آفت اٹھائی تھی کہ "اور پڑھاؤ لڑکیوں کو اردو۔ یہ دیکھو کیا عاشقانہ خط لکھا ہے۔" سارے گھر کو وہ خط پڑھوا یا گیا تھا۔ اور لڑکی کم بخت کا رو رو کر برا حال تھا۔ اس دن سے اس نے میاں کو میکے سے خط ہی نہ لکھا تھا۔

اس کے باپ بہت آزاد خیال تھے اور ولایت رہ کر آئے تھے اور جب حسن نے صفیہ کا پردہ توڑوا دیا تو بھی انھوں نے کچھ نہ کہا۔ اور وہ بھی سب کے خط کھول لیتے تھے۔ وہ جھینپ گیا معافی چاہی اور کہا کہ "میری نیت صفیہ بری نہیں تھی۔ عادت بری ہے معاف کر دو۔ سچ کوئی اور خیال نہ تھا۔

صفیہ خوش ہو گئی اور کہنے لگی "میں آپ کو خوشی سے اجازت دیتی ہوں کہ آپ میرے خط پڑھ لیں۔ میں نے تو ایک بات اصولاً کہی تھی۔" لیکن حسن مرزا نے بیوی کا خط نہ کھولا۔

حسن مرزا تاش کے دھنی تھے۔ برج بہت کھیلتے تھے۔ صفیہ کہتی تھی کہ جوا ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہاں ہے۔ لیکن اس میں ہم تمھاری بات نہ مانیں گے۔ صفیہ کہتی "تو یہ شہر میں جو جوئے کے اڈے ہیں ان کو کیوں پکڑتے ہیں۔ اس میں اور اس میں کیا فرق ہے۔" حسن مرزا نے بہت فرق سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ جوا تو اڈوں پر ہوتا ہے۔ اور کس طرح یہ اڈے والے بے ایمان ہوتے ہیں۔ لوگوں کو ٹھگتے ہیں۔ اور ان کی روزی صرف اسی اڈوں کے چلنے پر ہے۔ صفیہ کا جواب تھا کہ وہ اڈوں پر جوا کھیلتے ہیں۔ اور

079 www.taemeernews.com

آپ کلب میں۔ وہ انگریزی لفظ ہے اور یہ ہندوستانی ٹھگنے کے بارے میں تو آپ خود کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اور دو ایک وکیل ہیں وہ بہت بے ایمان ہیں اور وکیل رام ناتھ کی روٹی کا سہارا یہی برج ہے۔ مجھے تو دونوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ کہ وہی بات آپ لوگ کریں تو کچھ نہیں دوسرے کریں تو اکھیں بکرہ ہیں۔"

حسن مرزا نے ہنس کر کہا "بیوی جان ہم برج کھیلنا چھوڑ دیں گے۔"

"خیر یہ آپ کی ہٹ دھرمی ہے ورنہ اصولاً تو آپ کے کلب کے جوئے اور باڑے کے جوئے ایک ہی چیز ہیں۔ ہاں دونوں جوئے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔ یہ تو آپ مانتے ہیں؟"

"ہاں مانتا ہوں" حسن مرزا نے ماننے کو کہا۔

"تو آپ جب مانتے ہیں تو اسی بات کو کیوں کرتے ہیں"۔

حسن مرزا نے لاجواب ہو کر بیوی کو گود میں لے کر بھینچ لیا۔ اور اس کے منھ کو اپنے ہونٹوں سے بند کر دیا اور صفیہ کی آواز کہ "جب ایک بات سمجھ میں آ جائے تو پھر کوئی کیسے اس کے خلاف چل سکتا ہے"۔ پوری طور سے باہر نہ نکلنے دیا۔ اور پھر اٹھ کر کلب چلے گئے۔

شہر میں ہندو مسلمان فساد کا ڈر تھا۔ ہر گھر میں اسی بات کا چرچہ تھا۔ جگہ جگہ پولیس کا پہرہ تھا۔ حسن مرزا بھی دن رات لگے ہوئے تھے کھانے پر آ گئے پھر چلے گئے۔ رات کو اٹھ کر گشت لگانے گئے۔ صفیہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ہندو مسلمان لڑتے کیوں ہیں۔ وکیل برج لال تو حسن مرزا کے بہت دوست تھے اور صفیہ کو بھائی کہتے تھے اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ یہ سب قصور انگریزوں کا ہے۔ حسن مرزا کہتے تھے۔ یا صاحب تم

www.taemeernews.com

طالب علم تھے تو یہی پہنتے تھے کھدر پہن کر گھومتے تھے۔ اب ۸ سال نوکری کرکے معلوم ہوا کہ سب فضول کی باتیں ہیں۔ ہم خود ہی ایسے ہیں جیسی اور مذہب کی اینٹوں پر ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔

صفیہ سوچتی کہ آخر کبھی تو یہ بغض شروع ہوا ہوگا۔ اور اس کے شروع ہونے کی کوئی نہ کوئی وجہ بھی ہوگی۔ برج لال وجہ انگریزوں کا راج بتاتے۔ مسز برج لال دبے لفظوں میں مسلمانوں پر سارا الزام تھوپنے کی کوشش کرتیں اور سلطان حسن ایک اور وکیل جن کا آنا جانا بھی حسن مرزا کے ہاں تھا۔ تیز ہوکر مسز برج لال کی بات کو کاٹ کر ہندوؤں کو ملزم ٹھہراتے۔ اور حسن مرزا دونوں کو قصوروار ٹھہراتے۔ اس بھول بھلیاں سے باہر نکلنے کی صفیہ کوشش کرتی۔ "دیکھیے میں تو ہندو مسلمان فساد کو ایک بیماری خیال کرتی ہوں۔ جس طرح میری بچی رضیہ کو ابھی دو مہینے ہوئے ملیریا ہوگیا تھا۔ میں تو سمجھتی ہوں اسی طرح ہندوستانی سماج میں ہندو مسلمان فساد بھی ایک بیماری ہے۔ میں تو ڈاکٹر صاحب کی جان کھا گئی تھی کہ ملیریا کیا ہے۔ کیوں ہوتا ہے۔ کیا علاج ہے وہ چاہے عاجز آگئے ہوں لیکن میں نے تو ان کی ڈاکٹری کی کتابیں تک لے کر پڑھ ڈالیں۔ جب کہیں جاکر مجھ کو چین آیا۔ اور اب انشاءاللہ میں بھی دیکھوں گی کہ یہ ملیریا پھر رضیہ کو کس طرح ستائے گا۔ آپ لوگ بس چین سے بیٹھے ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں۔ اس کا قصور اس کا قصور۔ آخر جس طرح ملیریا کا کیڑا پکڑا ہی گیا اسی طرح اس کا سبب بھی معلوم ہوسکتا ہے۔ اور جس طرح کہ ملیریا کی دوا معلوم ہوگئی آخر اس کا بھی کوئی نہ کوئی علاج ہوگا۔ ابھی ابھی آپ کے مرزا صاحب نے دیکھیے فساد روک ہی دیا

081 www.taemeernews.com

ان سے پوچھئے دوا؟"

"یہ کوئی روکنا ہے۔ اب روک دیا۔ چھ مہینے بعد پھر سہی۔ میں تو ایسا علاج چاہتی ہوں جو اس کم بخت فساد کی "جڑ ہی" ملک سے جائے۔"

"ارے بھئی روکنا ووکنا کیا ہم تو سرکاری نوکر ہیں۔ حکم کی پابندی کرتے ہیں؟"

صفیہ نے بگڑ کر کہا۔" اچھی نوکری ہوئی۔ کل سرکار حکم دے کہ بے قصور کو پھانسی لگا دو۔ کیا کوئی پھانسی لگا دے گا۔"

حسن مرزا نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ بیگم جس کو نوکری کرنی ہوگی وہ ضرور لگا دے گا۔"

صفیہ حیرت سے اس کا منھ دیکھنے لگی۔ اس کو ایسا لگا کہ حسن مرزا نے اس کے منھ پر طمانچہ مار دیا ہو۔ چند سیکنڈ اس کی طرف دیکھا اور کھسیانی سی ہو کر بولی۔"

نہیں نہیں حسن تم تو ایسا ہرگز نہ کر سکو گے"۔ اور پھر ایک خاص توقع سے مرزا کی طرف دیکھنے لگی۔

"لیجئے بھابی آپ ہر بات کو اتنا بڑھا لیتی ہیں۔ بے قصوروں کو کون پھانسی لگواتا ہے ...... چلئے جائیے جا کر رضیہ کو لے آئیے۔ آپ تو ہر دفعہ بال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتی ہیں۔ فضول خود بھی پریشان ہوتی ہیں اور دوسروں کو بھی کرتی ہیں۔ سرکاری نوکری والوں اور خاص کر پولیس والوں کی بیویوں کو کوئی حق اس قسم کی باتوں کا نہ ہونا چاہیئے۔ ٹھیک ہے نا مرزا؟" حسن جو صفیہ کو ڈھائی سال میں اچھی طرح سمجھ گئے تھے چپکے

www.taemeernews.com

سے اٹھے سگریٹ جلا کر خاموشی سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔

صفیہ کی منجھلی بہن کی شادی بھی ٹھہر گئی تھی۔ صفیہ بہن کو بہت اچھا اور قیمتی زیور تحفہ میں دینا چاہتی تھی۔ اس نے گھر میں ہر طرف کفایت شعاری شروع کر دی تھی۔ حسن مرزا رشوت تو کبھی بھی نہ لیتے تھے لہذا تنخواہ اور بھتے میں بس اچھی طرح گزر کرتے تھے۔ بلکہ صفیہ اپنے میاں کی اس نیکی پر ان کی بہت عزت کرتی تھی۔ کئی بار اس قسم کے موقع خود اس کے سامنے آئے لیکن حسن مرزا ثابت قدم رہے۔ ویسے بھی طبعیتاً مرزا بہت نیک اور ایماندار آدمی تھے۔ سرکاری چپراسی جو پال رکھے تھے۔ ان میں ایک کو وہ دس روپیہ مہینہ دیتے تھے جب گھر کا کام کرنے دیتے تھے۔ دوسرے چپراسی صرف سرکاری کام کرتے تھے۔ شادی کے بعد پہلی سردیوں میں تو صفیہ حمل سے تھی پھر بچہ پیدا ہو گیا تو زیادہ تر وہ ماں کے ہاں ہی رہی۔ اور میاں کے ساتھ دوروں پر نہ جا سکی۔ گو اس کو گاؤں کی سبزی سے بہت دلچسپی تھی۔ اور گاؤں اس نے صرف ریلوں میں سے دیکھے تھے۔ اور اب قریب سے ان کو جاننا چاہتی تھی۔ دوسرے سال جب حسن دورے پر جا رہے تھے تو مع بیوی اور بچی کے گئے۔ صفیہ بہت خوش تھی ایک تو موسم اچھا اور حسن کو برج نہ ملتا تھا۔ تو زیادہ وقت دونوں کا ساتھ ہی گزرتا تھا۔ ہر جگہ تھانیدار کا بہت اچھا انتظام تھا۔ چیز وقت پر مہیا ہو جاتی۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے تک بیل گاڑیاں قلی۔ لاری۔ جس چیز کی ضرورت ہو وقت سے پہلے حاضر ہو جاتی تھی۔ مرغی۔ انڈے۔ گھی۔ دودھ کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اس شان و شوکت کو دیکھ دیکھ کر صفیہ بہت پریشان تھی کہ حسن سارا روپیہ اس طرح فضول اڑا دیں گے۔ تو وہ بہن کے لئے پھر کچھ نہ خرید سکے گی۔ اس نے

083 www.taemeernews.com

حسن سے کہا بھی کہ" اس سب شان کی کیا ضرورت ہے؟"
حسن نے کہا کہ" یہ سب تمھارے اپنے ہاتھ میں ہے تھانیدار سے جو کہو گی وہی تو لائے گا؟"
صفیہ نے تھانیدار کو بلا کر حساب مانگا تو وہ کہنے لگا" بیگم صاحب میری تو یہ خوشی تھی کہ آپ پہلی دفعہ میرے علاقے میں تشریف لائی ہیں میرا تو دل چاہتا تھا کہ آپ میری ہی مہمان رہتیں۔ صفیہ کے اصرار پر وہ راضی ہو گیا کہ حساب دے دے گا۔ صفیہ نے کہا کہ آپ روز مجھ سے پوچھوا کر چیزیں منگوایا کیجئے اور روز کا حساب دے دیا کیجئے گا۔ تھانیدار نے کہا کہ" بیگم صاحبہ یہ میرے لئے ذرا مشکل ہے۔ میں آخر میں اکٹھا لے لوں گا۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو آپ اپنے چپراسی کے ہاتھ کہلا بھیجیں حاضر ہو جائے گی۔"
صفیہ کو اطمینان ہو گیا لیکن وہ اس خیال سے کہ کہیں آخر میں دام زیادہ نہ لے لئے جائیں۔ ہر چیز کو دیکھ کر لکھ لیتی۔ یہاں تک کہ اس نے قلی اور گاڑیاں بھی لکھنی شروع کر دیں۔ اور اپنی طرف سے ہر کفایت شعاری پر تیار ہو گئی۔ جب پندرہ روز ختم ہوئے تو کئی بار مانگنے پر تھانیدار صاحب نے کہا کہ" صاحب حساب تو میں نے لکھا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بیس پچیس روپیہ خرچ ہوئے ہوں گے یہی دے دیجئے۔"
صفیہ بیس پچیس روپیہ کا نام سن کر حیران رہ گئی۔ وہ اگر پچاس ساٹھ بھی سن لیتی تو کچھ نہ کہتی۔ سمجھ گئی کہ تھانیدار ایک قسم کی رشوت دے رہا ہے۔ بگڑ گئی اور بولی" تھانیدار صاحب آپ

www.taemeernews.com

سے کچھ غلطی ہوئی ہے۔ میں اور میرے شوہر اس قسم کی باتیں پسند نہیں کرتے۔ پندرہ دن سے نو دس آدمی تو ہر جگہ کیمپ پر لگے رہتے ہیں قلی الگ۔ بیل گاڑیاں الگ۔ تین دفعہ پوری پوری لاری شہر سے آئی اور کھانا پینا۔ پھر ہر وقت لکڑیاں جلتی ہیں۔ آپ کس طرح کہتے ہیں کہ بیس پچیس روپے خرچ ہوئے۔"

تھانیدار بھلا تیس سال کی چھوکری کو کیا خاطر میں لاتا۔ بولا "بیگم صاحبہ پہرہ تو سرکاری ملازم دیتے ہیں۔ گاؤں کے چوکیدار ہیں۔ سمجھا ہیں۔ نوکر اسی دن کے لیے تو رکھے جاتے ہیں اور دیہات میں تو ہر چیز سستی ہوتی ہے آپ تو شہر کا حساب لگا رہی ہیں۔"

صفیہ تھوڑی سی چکرائی اور پھر سنبھل کر بولی۔ "اچھا ایک مرغی کے دام کیا ہوتے ہیں۔"

"یہی دو تین آنے ہوں گے۔" اس نے لاپرواہی سے کہا۔ ... "کیوں بے مرغی کے دام کیا ہوتے ہیں؟" تھانیدار نے ایک دیہاتی کو آواز دی اور ساتھ ہی دو انگلیوں کا اشارہ کر دیا۔ ایک تو دیہاتی ڈر گیا اور پھر سمجھا کہ تھانیدار صاحب ذرا اچھی قیمت پر مرغیاں بیچنا چاہتے ہیں گھبرا کر بولا۔ "حضور دو روپے۔"

"ابے تو نے تو گھوڑے کے دام بتا دیئے۔ مرغی کے پوچھ رہا ہوں مرغی کے۔"

اس نے تھانیدار صاحب کی پھر دو انگلیاں دیکھیں اور اب سمجھ کر بولا۔ "دو آنے ...." صفیہ ہنس پڑی۔ تھانیدار خفیف ہو گیا لیکن صفیہ کو بھی بات کی تہہ تک پہنچنے کی بیماری تھی۔ بولی۔ "اچھا

www.taemeernews.com

تھانیدار صاحب میں آپ کو معلوم کر کے تھوڑی دیر میں دیہاتوں کی قیمتوں کا پتہ بتا دوں گی۔" یہ کہہ کر گاؤں جو قریب ہی میں تھا اس کی طرف چلی۔ تھانیدار صاحب بے بس ہو کر حسن مرزا کی تلاش میں نکلے۔ دیر بعد مرزا ان کو ملے۔ انھوں نے نرم لہجے میں صفیہ کی شکایت شروع کی: "مرزا صاحب مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی۔ میں بیگم صاحب کو سمجھا نہیں۔ میں نے کہا کہ جیسی اور بیگم صاحب آتی ہیں۔ بل دیکھ کر خوش ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح بیگم صاحب کو بھی خوش کر دوں۔" بات کیا ہوئی؟" حسن مرزا نے پوچھا۔

"بیگم صاحب نے مجھ سے شروع میں کہا تھا کہ حساب دے دیا کرو۔ آج میں نے حساب پیش کیا تو بہت ناراض ہوئیں۔"

مرزا خود سمجھے کہ خرچ اس دفعہ بہت ہی بے ڈھنگا ہوا ہے اور صفیہ روپیہ جوڑنے پر تلی ہوئی ہے۔ پوچھنے لگے۔ "کل کتنا ہوا؟"

"صاحب بس پچیس روپیہ مانگے تھے۔" حسن مرزا نے حیرت سے تھانیدار کی طرف دیکھا اور کچھ سمجھ نہ سکے۔

"بیگم صاحب خفا اس بات پر ہیں کہ بل بہت کم ہے۔" اب مرزا سمجھے کہ کیا کریں صاحب ہماری تو ہر طرح مصیبت ہے۔ اب کوئی افسر آتا ہے تو وہ بل ہی نہیں مانگتا۔ کوئی آتا ہے تو تھوڑا دے کر سمجھتا ہے کہ میں نے بہت دے دیا۔ صاحب یقین مانیئے۔ ہر جاڑے میں ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ میرا اپنی گرہ سے اٹھ جاتا ہے۔ مرزا صاحب آپ سے تو کوئی پردہ نہیں۔ ایک آپ ایسے افسر ہیں کہ آدمی کھل کر بات کر سکتا ہے۔ ۹۵ روپیہ میری تنخواہ ہے۔ اب آپ ہی بتائیے میں یہ ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ کیا اپنے باپ کے گھر سے لاتا ہوں۔ اب بیگم صاحب شکایت کر رہی ہیں کہ تم نے حساب غلط دیا۔ غلط نہ

086 www.taemeernews.com

دیں تو کیا کریں۔ ابھی پچیس دن ہوئے کلکٹر صاحب دورہ کر کے گئے ہیں۔ بارہ دن رہے۔ ساتھ کئی دوست شکار کو لائے تھے۔ بس خرچ کا کچھ نہ پوچھئے۔ میں نے حساب صرف ۵۵ روپیہ کا دیا۔ میم صاحب نے کاٹ کوٹ کر مشکل سے ۲۸ روپیہ پکڑا دیئے۔ یہ دیکھئے"۔ جیب ٹٹول کر ایک مڑا مڑا یا کاغذ نکالا"۔ لیجئے یہ دیکھئے۔ اب بیگم صاحب یہ"۔ اتنے میں صفیہ پیچھے سے نمودار ہوئی اس کا غصہ اور بھی بڑھا ہوا تھا۔ وہ بھی حسن مرزا کے پاس انصاف کے لئے آ رہی تھی۔ تھانیدار اس کو دیکھ کر چلنے لگا۔ اس نے مڑ کر کہا "ٹھہرئے تھانیدار صاحب!" تھانیدار نے سلام کر کے کہا کہ "میں مرزا صاحب سے اپنی غلطی کا اعتراف کر چکا ہوں۔ بیگم صاحب اس میں میرا کیا قصور ہے یہاں کا قاعدہ یہی ہے"۔ صفائی میں اس نے وہ پرچہ پھر پیش کیا اور سب باتیں بھی دہرائیں۔ صفیہ یہ سن کر بالکل حیران ہو گئی۔ لیکن پھر بھی اس نے اپنا مورچہ نہ چھوڑا اور بولی۔ "خیر آپ مرزا صاحب کو تو جانتے ہیں وہ تو کئی بار آ چکے ہیں؟

اس کے اس سوال سے مرزا صاحب کے دل میں ایک تیر لگا۔ اور تھانیدار نے مرزا کی طرف دیکھا اور بھانپ کر بولا۔ "بیگم صاحب اگر سچ بولنے کی اجازت ہو تو مرزا صاحب کا خرچ ہی کیا ہے۔ ایک چڑیا ماری اور بھون کر کھالی اور رہا ادھر سے ادھر جانے کا خرچ وہ تو ایک جگہ ٹک گئے۔ گھوڑا لیا گھوم آئے۔ یہ سب جو اتنا ہوا یہ تو آپ کی وجہ تھی۔ اور مرزا صاحب تو دو تین دن سے زیادہ کبھی رہے بھی نہیں"۔

بات معقول تھی۔ صفیہ چپ ہو گئی۔ مرزا نے دونوں کا سمجھوتا اس بات پر کرا دیا کہ جو جو لوگ وہاں موجود تھے ان سب کو معاوضہ دے دیا

087
www.taemeernews.com

جائے اور جہاں سے چلے آئے تھے وہاں پھر جانا تو مشکل تھا۔ لہذا یہاں کا حساب تھانیدار صاحب ہی بھیج دیں۔ صفیہ نے پھر اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن اس کے لئے وہ دورہ خاک میں مل گیا۔ ان سب بیگاریوں کی صورتیں جس کو وہ دام نہ دے سکی تھی۔ اس کو چین نہ لینے دیتی تھیں — اور مرغی کھانی تو اس نے بالکل چھوڑ ہی دی تھی۔ مرزا بھی کچھ نہ کہتے تھے۔ لیکن جب کبھی دورے کا ذکر آجاتا صفیہ کی صورت ان کو شرمندہ کر دیتی تھی۔ مرزا خیال ضرور رکھتے تھے کہ بیگار ان کی وجہ سے نہ ہو لیکن پھر بھی کہاں تک بچ سکتے تھے۔ سب ہی لوگ کرتے تھے۔ لیکن مرزا کا ضمیر بیکار اٹھتا تھا کہ تو نے صفیہ کی طرح احتیاط کیوں نہ برتی۔ اب ان کے دل میں صفیہ سے ایک قسم کا ڈر پیدا ہونے لگا۔ پولیس کی نوکری میں اتنے زبردست اصول کس طرح نبھ سکتے تھے۔ اب ایک موٹر والے نے ان سے موٹر ٹھیک کروانے کے دام نہیں لئے تھے۔ انھوں نے جیل تک کی دھمکی دی تھی۔ نواب جعفر علی ہر ڈپٹی کو ہر سال کم از کم آم اور میوہ وغیرہ ضرور بھیجا کرتے تھے۔ مرزا کے نہیں کرنے پر وہ خود آکر بیٹھ گئے کہ آپ صاحب ہماری محبت کو کیوں ٹھکراتے ہیں۔ مرزا نے ہزار سمجھایا کہ صاحب میں نے آپ کو کبھی پہلے دیکھا نہیں، وہ مانے ہی نہیں۔ مہینہ بھر بعد کچھ ضرورت سے آکھڑے ہوئے۔ اور مرزا کو مروت میں وہ کام کرنا پڑا۔ وہ جانتے تھے کہ صفیہ تو نہیں کر دیتی۔ لیکن صفیہ تو کھری تھی اور یہ بیچارے مروت میں اکثر مارے جاتے تھے۔ صفیہ کے دل میں جہاں اور ہزار سوال اور کانٹے تھے۔ یہ مسز مارٹن کے بیس روپیہ کا بہت بڑا کانٹا تھا۔ اس کو پہلی دفعہ احساس ہوا کہ انگریز لکھتے کچھ اور ہیں اور کرتے کچھ اور ہیں اور نہ معلوم کیوں اس کو اب مسز مارٹن پر بھی شبہ ہونے لگا۔ اور میاں بیوی کے

www.taemeernews.com

درمیان ایک ہلکا سا پردہ پڑ گیا۔

دورے سے آکر چند روز بعد جو کلب گئی تو سب نے عادتاً پوچھا۔ کہ کہو کیسا وقت گزرا اور مسز ٹامس تو صفیہ پر خاص مہربان تھیں پوچھنے لگیں کہاں کہاں گئی تھیں؟ صفیہ نے سب بتایا اور پوچھا کہ آپ لوگوں کا خرچ کتنا ہوتا ہے۔ مسز ٹامس جو ایک انگریز شریف خاندان کی بیوی تھیں اس قسم کی بدتمیزی کی گفتگو کی عادی نہ تھیں۔ صفیہ کو کلچرڈ ہندوستانی سمجھتی تھیں۔ یہ سوال سن کر لال ہوگئیں اور سرد مہری سے کہنے لگیں۔ "یہ سوال تو بالکل پرائیوٹ ہے۔ آپ کیوں پوچھتی ہیں؟" صفیہ نے کہا کہ میرا کوئی ارادہ نہیں۔ لیکن میں نے اس دفعہ اندازہ لگایا تو خرچ تو بہت ہوتا ہے۔ لیکن بل ہم لوگوں کو بہت ہی کم دیا جاتا ہے۔

"کم دیا جاتا ہے"؟ مسز ٹامس نہیں"۔ اس دفعہ تو تھانیدار نے مجھے لوٹ ہی لیا تھا۔ کیوں جیک! وہ تو اگر میں حساب نہ دیکھ لیتی تو شاید مجھے ٹھگ کر ہی لے جاتا۔"

وہ تو رو گ ہے۔ سب تھانیدار اور تحصیلدار ایک سے ہیں میں تو اصولاً ان کے بل کو ادا کر دیتا ہوں"۔ کلکٹر جیک ٹامس بیوی کی گواہی کو آگے بڑھے۔ اصول کا نام سن کر صفیہ چونک پڑی۔ اس کے لئے ساری زندگی ہی ایک اصول تھی۔ مرزا مذاق میں اس کو بی بی اصولاً کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ صفیہ کا چہرہ دیکھ کر مرزا گھبرا گئے ٹائی کھینچنے لگے۔ کہا بیٹھی کہ صفیہ کی آنکھ مل جائے لیکن صفیہ اس نئے اصول کو پوری طرح سمجھنے کے لئے تیار ہوگئی۔ اور کہنے لگی "مسز ٹامس آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

مسز ٹامس نے شوہر کے بدلے جواب دیا اور کہا کہ "سب نیٹو بے ایمان ہوتے

089 www.taemeernews.com

ہیں۔" پھر صفیہ کی طرف دیکھ کر جلدی سے بولیں۔" میرا مطلب سب نیچے طبقہ کے نوکر پیشہ اور قلی لوگ . . . . .

صفیہ جس کا ارادہ لڑائی کرنے کا نہ تھا اور جس نے یہ بات دراصل تھانیدار کو جھوٹا ٹھہرا کر اپنے ضمیر کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں کی تھی جو صرف مسز ٹامس ہی کی نہیں بلکہ سارے انگریزوں کی دل سے عزت کرتی تھی۔ اور جو ایک شبہ اس کو ان کی طرف سے پیدا ہو چلا تھا۔ اس کو مٹانا چاہتی تھی مسز ٹامس کے اس جواب کے لئے بالکل تیار نہ تھی گو اس نے کہلنگ کو بھی پڑھا تھا اور اس نے کئی جگہ یہی الفاظ لکھے تھے لیکن معلوم کیوں اس نے کبھی اس کی طرف غور نہیں کیا تھا گو آنکھیں انگریزی ادب میں ایسی چیزیں ڈھونڈھنے کی عادی تھیں۔ لیکن کان نہ تھے اور گو مسز ٹامس نے اپنے ان لفظوں کو جس کو صرف وہ انگریزی سوسائٹی میں بولنے کی عادی تھیں اور جو غلطی سے ان کے منہ سے نکل گئے تھے تشریح کر کے ڈھانکنا چاہا تھا۔ لیکن وہ اپنا کام کر چکے تھے۔ صفیہ کے بدن میں ایک کپکپی جاری ہو گئی۔ لیکن وہ نہایت سنجیدہ الفاظ میں مسز ٹامس کے جملے کو کاٹ کر بولی " آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ مسز ٹامس ہندوستانی تو ہوتے ہی بے ایمان ہیں۔ لیکن آپ انگریزوں کی ایمانداری بھی دیکھ لی۔ ۱۲ روز آپ چھ دوستوں کو لے کر دورہ پر رہیں۔ شکار کھیلا۔ ہکوا ہوا سینکڑوں قلی لگے۔ تین لاریاں ہر وقت آپ کے حضور میں کھڑی رہیں۔ کھانے پینے کا سامان الگ۔ جب بے ایمان سندر سنگھ نے آپ کو پچیس روپیہ کا بل دیا تو آپ نے اصولاً آدھا کر کے تیس پکڑا دیئے۔ بہت لاجواب یہ انگریزی اصول ہے۔"

090 www.taemeernews.com

مسز ٹامس اپنی حرکتوں سے ہر ہندوستانی جس سے وہ بات کر لیتیں یہ ظاہر کر دیتیں کہ یہ ان کی خاص عنایت ہے۔ انھوں نے تکلیف فرمائی ہے۔ وہ کلکٹر کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اپنے کو ضلع کی ملکہ سمجھتی تھیں اور پہلی دفعہ کسی نے ان کے ساتھ اتنی گستاخی کی تھی۔ غصہ میں لال ہو کر کھڑی ہو گئیں اور بولیں "How dare you?" مسز ارگن جو سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی تھیں اور اتنی ہی غصہ میں بھری تھیں بولیں۔

"تمھیں کیسے خبر ملی؟" صفیہ ایک سکنڈ تو رکی پھر بولی۔ "میں نے سندر سنگھ کے پاس خود سارا حساب دیکھا ہے"۔

پریتم سہائے جائنٹ مجسٹریٹ جو کھڑے یہ سن رہے تھے آگے بڑھے اور کہنے لگے "سندر سنگھ کی کس طرح مجال ہوئی۔ اور مجھے پوری امید ہے کہ سندر سنگھ سے غلطی ہوئی ہے۔ اور وہ آپ سے معافی مانگ لیں گے"۔ مسز ٹامس نے پھر ایک دفعہ اپنی اونچی جگہ سنبھالی ان کو صفیہ کی باتیں بالکل ایسی لگیں تھیں جیسے وہ کسی فنکشن پر صدر بننے آئی ہوں اور کسی مسخرے نے پیچھے سے کرسی کھسکا دی ہو اور وہ بھری مجلس میں ٹانگیں اونچی کر کے گر پڑی ہوں۔ پریتم سہائے نے صفیہ کو غلط ثابت کر کے ان کو پھر سے اپنی جگہ پر کھڑا کر دیا تھا۔

صفیہ نے آنکھیں پھاڑ کر پریتم کی طرف دیکھا۔ پریتم کو وہ پہلی دفعہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی ساری پرانی باتیں بس شیخیاں ہی تھیں۔ پریتم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "پریتم صاحب آپ کیوں اتنے بے چین ہو گئے۔ معافی تو مسز ٹامس کو مانگنا چاہیئے۔ انھوں نے پہلے ہم سب کو بے ایمان کہا تھا جس میں آپ بھی شامل ہیں"۔

حسن مرزا گھبرا کر گردن کھجاتے ہوئے کمرے باہر چلے گئے۔ اول تو صفیہ

091
www.taemeernews.com

کو ان کی مدد کی ضرورت ہی نہ تھی۔ اصول کے سوال پر وہ اکیلی مسز ٹامس کیا ایک پوری رجمنٹ کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ صفیہ کے جواب کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ایک انگریز مرد اور دو عورتیں وہاں موجود تھے۔ تینوں سرخ چقندر بنے کھڑے تھے۔ صفیہ ظاہر میں بالکل ساکن اور اندر ایک تندور کی طرح بھن رہی تھی اور پریم سہائے بالکل اس کوڑے کی طرح کمرے میں ڈھیر تھے جو اڑ اڑ کر مہمانوں کے سامنے میزبانوں کو شرمندہ کر رہا ہو۔

صفیہ اٹھی اپنا بٹوا اٹھایا اور کلب کے باہر جا کر اپنی موٹر میں بیٹھ گئی۔ اس کے جاتے ہی مسز مورگن نے زور سے سانس لیا اور کہا "ویل!"

مسز ٹامس کو پھر قدرت نے زبان دی اور بولیں "اپنے سب آرڈی نیٹ سے ایک ہو کر ملنے کا یہ نتیجہ ہے۔"

بیوی کو موٹر میں بیٹھا دیکھ کر حسن مرزا بھی موٹر میں جا بیٹھے اور موٹر کو چلا کر گھر چلے گئے۔ نہ راستہ میں دونوں نے بات کی اور نہ گھر پہونچ کر۔ مرزا ٹہلنے چلے گئے۔ صفیہ کرسی پر بیٹھی رہی۔ اس کے سر میں اب ایک بھی خیال نہ تھا مرزا واپس آ کر پولیس کے فائل نکال کر کام کرنے لگے۔ شادی کے تین سال کے عرصہ میں پہلی رات دونوں نے ایک دوسرے سے نہ بات کی اور نہ کھانا کھایا۔

صبح سویرے ہی مرزا پھر گھر سے نکل گئے۔ صفیہ اب پریشان تھی۔ وہ جان رہی تھی کہ حسن اس سے بہت ناراض ہیں۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ وہ اپنے ایمان کو حسن پر قربان نہ کر سکتی تھی حسن نے دوپہر کو بھی کھانا نہ کھایا۔ نہ معلوم کہاں رہے۔

شام کو برج لال ان کی بیوی اور سلطان حسن آ گئے۔ بات کلب سے کچھ کچھ باہر نکل چکی تھی۔ وکیلوں کے بار (BAR) میں بھی اسی پر چہ میگوئیاں

092
www.taemeernews.com

ہوئیں تھیں۔ کچھ لوگ مسز ٹامس سے غصہ تھے۔ کچھ پریم سہائے سے۔ اور سب کے سب اس بات کو دیکھنے کے شائق تھے کہ اتنی بڑی بات ہوگئی اس کا حسن مرزا پر کیا اثر پڑے گا۔ سندر سنگھ کے ختم ہو جانے میں کوئی شبہ باقی نہ تھا۔

صفیہ کا منھ دیکھ کر جس پر ۲۴ گھنٹے کے فاقے کا اثر تھا کسی کی ہمت نہ ہوئی کہ بات کو دہراتا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ حسن مرزا آئے اور آتے ہی صفیہ پر برس پڑے۔ بس جوش ہوگئیں لڑکر ایک قلعہ اپنے چاروں طرف بنا لیا ہے۔ نہ معلوم کس دنیا میں رہتی ہیں۔ اگر آپ کے اتنے کڑے اصول ہیں تو گھر پر رہیے۔ کس نے کہا کہ دنیا بھر میں گھومتی پھریئے۔ کوٹ اتار کر کرسی پر پھینک دیا اور بریج لال سے بولے "یار عجب آفت میں جان ہے۔ فضول مجھ میں اور مورگن میں جھگڑا ہوگیا۔۔۔ یا کسی نے جواب نہ دیا۔ صفیہ تو بالکل بت تھی۔ مرزا ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ رومال سے پسینہ پونچھا اور پھر کہنے لگے "یہ گھر میں بیٹھی بیٹھی۔ ایمان داری سچائی وغیرہ کے اصول چھانٹا کرتی ہیں۔ یہ کیا جانیں کہ کس مصیبت میں ہم لوگ پڑ کر کام کرتے ہیں"۔ "ہاں بہن ہمیں عورتوں کو کیا۔ باہر مرد چاہے کچھ ہی کریں"۔ مسز بریج لال جنھیں ٹھیک سے خبر نہ تھی کہ کیا معاملہ ہے سمجھانے لگیں۔

صفیہ کو سب نے مل کر ایک چور سا بنا دیا۔ وہ اپنے کو اس خرگوش کی طرح محسوس کرنے لگی جو بالکل بے قصور ہوتا ہے اور شکاری اس کو ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔

"خود تو لڑ آئیں۔ میرا تو خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اس غریب سندر سنگھ کو بالکل برباد کرا آئیں۔ آج مورگن کہہ بھی رہا تھا کہ سندر سنگھ۔۔۔۔"

"کیا مورگن سے بھی تم سے باتیں ہوئیں؟" بریج لال نے پوچھا۔

093 www.taemeernews.com

باتیں ہوئیں!" مرزا خشک ہنسی ہنسے۔ تین بجے دفتر پہونچا تو مور گن کا ایک پرچہ رکھا تھا کہ مہربانی سے مجھ کو آکر ملو۔ اس کے گھر گیا تو ایک گھنٹہ بدمعاش نے مجھ کو کھڑا رکھا اور پھر دفتر میں بلایا۔ اور پھر کہنے لگا۔ مجھ کو بہت افسوس ہے کہ تمھاری بیوی اور مسز ٹامس میں جھگڑا ہوگیا۔ میں نے کہا کہ مجھ کو بھی افسوس ہے۔ پھر کہنے لگا کہ مسز ٹامس کہا اس بات کی توقع رکھتی ہیں کہ تمھاری بیوی ان سے معافی مانگیں۔ میں نے کہا کہ یہ عورتوں کی باتیں ہیں۔ مسٹر ٹامس کو جو کچھ کہنا ہے میری بیوی سے جاکر کہیں۔ آپ کو اور مجھ کو اس بیچ میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ جھلا پڑا اور کہا کہ میں نے ہی نہیں بلکہ سب افسروں نے تم کو کبھی چھوٹا نہ جانا اور برابر کا سمجھ کر ملے۔ لیکن تم کو اپنی جگہ نہ بھولنی چاہیے مسز ٹامس ہی نہیں بلکہ میں بھی سوچتا ہوں کہ تمھاری بیوی کو معافی مانگنی چاہیے میں نے کہا کہ آپ مجھ کو یہ یعنی جو آپ کہہ رہے ہیں ایک حکم کی صورت میں لکھ کر دے دیجیے اگر مجھ کو نوکری کرنی ہوگی تو میں معافی مانگ لوں گا۔ میری بیوی سرکاری نوکر نہیں ہے۔ اور نہ مسز ٹامس سرکاری حاکم۔ بس بھنا کر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا کہ مرزا تمھارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ میں نے کہا جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ غرض کہ بہت سخت باتیں ہوئیں۔" پھر مرزا سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ۹ سال کی نوکری میں کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ پھر مرزا اٹھے اور نوکر کو آواز دی کہ چائے لے آئے۔ پھر ٹہلنے لگے۔ کبھی سگریٹ جلاتے کبھی پھینک دیتے۔ پھر بولے۔" ان انگریزوں کے تو منھ ہی نہ لگنا چاہیے۔ ارے کبھی تمھاری بلا سے کوئی کچھ دے یا نہ دے تم کو کیا تم اپنا حساب صاف رکھو۔ تمھیں کیا کوئی دس دے یا سو ــــ"

"مسز ٹامس نے پہلے ہندوستانیوں کو بے ایمان کہا تھا۔" صفیہ نے بڑی کوشش کر کے بڑی خشکی سے کہا۔ مرزا نے کوئی جواب نہ دیا۔" تو کیا آپ

www.taemeernews.com

چاہتے ہیں کہ میں مسٹر ٹامس سے معافی مانگوں؟"

"کون کہتا ہے کہ تم معافی مانگو!" مرزا ایک بار پھر برس پڑے۔

چائے آگئی۔ نوکر توس مکھن بھی لے آیا۔ مرزا بناکر پینے لگے۔ نہ مہمانوں کو پوچھا نہ بیوی کو۔ کچھ عجیب موقع تھا سب چپ تھے۔ سلطان حسن نے خاموشی کو توڑا اور کہا۔ چلو بھئی برج لال چلو اب۔ تینوں آہستہ اٹھ کر چلے گئے۔ باہر برآمدے میں آکر برج لال نے کہا۔ "دیکھو یار سلطان یہ باتیں باہر نہ نکلیں ورنہ بیچارے کے لئے اور برا ہو جائے گا۔" سلطان نے بھی سر ہلا دیا۔

مرزا نے چائے پی اور توس کھائے۔ پیٹ میں گرمی پہونچی تو مزاج ٹھنڈا ہوا اور ہوش آیا۔ بیوی کی صورت کی طرف دیکھا تو وہ چپ بیٹھی دروازے سے باہر گھور رہی تھی۔ چہرہ فاقے کی وجہ سے اور بھیانک ہو رہا تھا۔ مرزا اس کی طرف دیکھتے رہے پھر آہستہ سے پکارا! "صفیہ"!

صفیہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ لیکن وہ ویسے ہی بیٹھی رہی۔ مرزا نے انگریزی میں کہا۔ "صفیہ یہاں آؤ۔"

صفیہ اٹھی اور زمین پر دوزانو ہو کر حسن کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مرزا نے اٹھا لیا اور پرانی آواز میں کہا "ایک تو لڑکا میں اب روتی ہو رونے کی کیا بات ہے۔

"حسن میں اپنی گھر چلی جاؤں گی ۔۔۔۔ آپ کو میری وجہ سے تکلیف ہوئی۔"

صفیہ نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔" میں اب چلی جاؤں گی۔"

"کہاں"

"کیا آپ سچ مچ سوچتے ہیں کہ میں نے غلطی کی!"

095
www.taemeernews.com

"ہاں ذکر تو تم نے ہی چھیڑا تھا۔"

"لیکن میرا ارادہ وہ پچھلی کی بات کہنے کا نہ تھا۔ وہ جب انھوں نے سب ہندوستانیوں کو بے ایمان کہا تو میں غصہ میں کہہ گئی۔" تھوڑی دیر ٹھہر کر "تو کیا آپ سچ مچ سمجھتے ہیں کہ مجھ کو معافی مانگنی چاہیئے۔؟"

مرزا نے آہستہ سے سر ہلایا اور کہا کہ "نہیں۔ یہ میں نے کبھی نہیں کہا۔"

صفیہ نے حسن کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اور اپنا منہ اس کے سینہ میں چھپا کر کہا کہ "اگر آپ کہتے بھی تو میں نہ مانتی کیوں کہ میں نے سچی بات کہی تھی۔" دونوں رونے کے بعد جو آپس میں ایک ہلکا سا غبار لئے تھے وہ بھی بھول گئے۔ اور کل کی بات بھی اب کھل کر کرنے لگے۔ جیسے دونوں نے پھر سے ایک دوسرے کو پا لیا ہو۔

096

www.taemeernews.com

صفر

"ابّا جان، سعید بھائی جا رہے ہیں۔"

"ہوں!" چیف جسٹس سر عطاء اللہ نے بلاٹنگ کو جلدی سے چھپاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ نے ان کو نکال ہی دیا؟" زکیہ کی آنکھوں میں نفرت اور بغاوت کی چمک تھی۔

"تم کو ان باتوں سے کیا مطلب، جاؤ تم اپنا کام کرو"۔ جج صاحب نے جھلا کر کہا۔

"تو آپ مجھ کو بھی جانے دیجئے۔"

کہنا تو چاہتے تھے کہ "جاؤ تم بھی دفع ہو"۔ لیکن بیٹی ذات تھی۔ اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا اور خون کا گھونٹ پی کر صرف اتنا ہی کہا "جاؤ یہاں سے۔ زکیہ! مجھے کام کرنے دو۔"

097
www.taemeernews.com

جج صاحب نے اپنی کہنیاں میز پر ٹیک دیں۔ نظریں فائل پر تھیں لیکن دماغ کہیں اور تھا۔ آج ان کو سعید پر زیادہ غصہ آرہا تھا۔ خود نالائق ہو تو ہو، ذکیہ کا بھی ناس کر رہا تھا۔ ذکیہ کی ہمت تو دیکھو مجھ سے دو بدو لڑنے آئی۔ اٹھائیس سال کی عمر ہوگئی اور بکا ہی گھومتے ہیں۔ اس عمر میں میں نے کیا کیا نہ کیا تھا۔ مفت کا آرام ملے تو آنکھوں پر چربی چھا جاتی ہے۔ جب ابا مرے تھے تو چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر مرے تھے۔ اماں بیچاری نے سلائیاں کیں، چکی پیسی۔ میں نے تیرہ سال کی عمر سے بچوں کو پڑھانا شروع کیا تھا۔ اُف! اس غربت اور مصیبت کا خیال کر کے کتنی تکلیف ہوتی ہے اور آج یہ صاحبزادے آنکھ میں آنکھ ملا کر کہتے ہیں آپ نے کیا ہی کیا؟ آپ کے امیر ہو جانے سے کس کا فائدہ ہوا؟

گدڑھے میں سے نکال کر میں نے ان سب کو آسمان پر پہونچا دیا جو آج یہ اس قابل ہوئے کہ کارل مارکس بغل میں دبائے گھومتے پھرتے ہیں۔

ہمارا گھر تھا ایک کالی اندھیری کوٹھری اور چھوٹا سا آنگن۔ برسات بھر ہم سب کے سب اس کو لیپ پوت کر کھڑا رکھتے تھے۔ ایک کھٹیا پر تین تین سوتے تھے۔ آج نواڑ کے پلنگ پر اینٹھ کر سعید صاحب سوچتے ہیں کہ وہ دنیا کی حالت بدل دیں گے اور پھر خوبی یہ ہے کہ فرماتے ہیں کہ اگر آپ کی اولاد کو بڑی بڑی نوکریاں مل بھی گئیں تو فائدہ کس کا ہوا جو پرانے زمانے میں آپ کے ساتھی تھے ان کا تو الٹا نقصان ہوا۔ ان کے دشمنوں میں ایک اور کا اضافہ ہوگیا۔ آپ کو ان غریبوں سے کیا ہمدردی ہے۔ جو آج تک اسی حالت میں پڑے ہیں، آپ ہر اس قانون کی حفاظت کرتے ہیں جس سے آپ کے پرانے طبقے کی حالت بدلنے نہ پائے۔

098
www.taemeernews.com

میں نے اپنی حالت بدل لی ۔ میں نے منع کیا تھا اوروں کو کہ تم نہ بدلو میرے دماغ تھا۔ سمت تھی ۔ آگے بڑھ گیا ۔ وہ جاہل دست ۔ وہ کیا اپنی حالت بدل لیں گے۔

کہتا ہے کہ آپ کی ساری محنت جو آپ نے چیف جسٹس بننے میں صرف کی ہے بیکار گئی ہے ۔ بالکل بیکار ۔ اس نے بیکار کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا بلکہ کہا تھا کہ آپ نے غداری کی ہے ۔ غدار وہ ہے یا میں ہوں ! وہ میری ساری محنت کو مٹا دینا چاہتا ہے ۔ خود ایک نمک حرام غدار کی حیثیت سے میرے گھر میں رہتا ہے ۔ میں نے خود محنت کر کے یہ سوسائٹی بنائی ہے ۔ وہ کون ہے ۔ ۔ ۔

"ابراہیم ! ابراہیم ! جاؤ بھائی ایک اکا تو لے آؤ" گھر کے دوسری جانب سے آواز آئی ۔

اس آواز کو سن کر جج صاحب کے غصے میں اور اضافہ ہو گیا ۔ اب یکے میں بیٹھ کر یہاں سے تشریف لے جائیں گے ۔ مجھ کو ذلیل کرنے کے لئے ۔ جانتے ہیں کہ شام کو اکثر معزز لوگ یہاں آتے ہیں تو ان کو دکھانے کو ۔ میں نے کئی بار کہا کہ جاؤ یہاں سے ۔ اگر ایسا کام کرنا ہو تو کسی دوسرے شہر میں دفع ہو ۔ تو وہ کبھی نہیں مانتے ۔ فرماتے ہیں کہ میں تو جہاں مجھ کو حکم ملے گا ۔ وہیں کام کروں گا ۔ حکم ملے گا انھیں ! ہے کون انھیں حکم دینے والا ! باپ کا حکم یہ نہ مانیں ۔ ماں تو خیر سوتیلی ٹھہری ۔ دادی کا کہنا یہ نہ سنیں ۔ حکم مانیں گے کس کا ؟ پارٹی کا ! پارٹی کیا بلا ہے ؟ قید یافتہ بدمعاشوں کی ایک جماعت جو کسی کو بڑھتے پنپتے نہیں دیکھ سکتے ۔ دوسروں کی دولت چھین کر بانٹیں گے ۔ کبھی دولت جمع کی ہو تو جانیں کہ دولت کن مصیبتوں سے جمع

099 www.taemeernews.com

ہوتی ہے۔

ٹھنڈا سانس لے کر کون سی نوکری تھی جو میں اس کو نہیں دلوا سکتا تھا۔ آخر بڑے تین لڑکے لگ ہی گئے۔ ایک خدا کے فضل سے اب کلکٹر ہو جائے گا۔ دوسرا ریلوے میں ہے۔ تیسرا پولیس میں ہے۔ یہ حضرت نوکری نہیں کرتے جب سمجھایا کہ بھئی اس قسم کی حرکتیں چھوڑ دو۔ کچھ کام ہاتھ میں لو۔ تو جواب سن لو کہ جس زینہ پر سے آپ اکیلے چڑھ کر اتنے پہونچے ہیں وہاں میں سب کو سارے جہاں کو لے کر پہونچوں گا۔ اب سارے کے سارے کیسے ایک سے ہو سکتے ہیں۔ صاحبزادے بے غیرت ایسے ہیں کان پور گئے تھے۔ چھ مہینے نہ رہ سکے کوٹا ئیفائڈ ہو گیا۔ جو دوست ہیں مخلص وہ کامریڈ کہتے ہیں دو دن خدمت نہ کر سکے۔ جا کر اسپتال میں پٹک آئے ذرا برا نہ مانا اور لگے الٹا انھیں کی تعریف کرنے کہ کوئی ڈاکٹر یا نرس تو وہ لوگ ہیں نہیں۔ پیسہ ان کے پاس نہیں اگر اسپتال نہ لے جاتے تو میں مرجاتا۔ دادی کے چہیتے ہیں۔ انھوں نے رو رو کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا پھر کہیں جا کر زندہ ہوئے تو اب پھر سے وہی جنوں ... ...

"ارے ابراہیم۔ کلثمی تم ابھی گئے یا نہیں؟"

"اچھا! ابھی گئے نہیں ہیں؟ مصیبت کی زندگی کو جان بوجھ کر اپنا لینا یہ کہاں کی عقل ہے۔ سارے جہاں کا درد اپنے دل میں سما لینا یہ کون سی دانش مندی ہے بھئی تم اپنی فکر کرو۔ تمھیں دوسروں سے کیا؟ اگر لوہار کے لڑکے بھوکوں مرتے ہیں تو تمھاری بلا سے۔ جو کھنگی ہیضہ سے مر گئے تو تمھیں کیا۔ تم اپنی فکر کرو۔ روپیہ کماؤ آرام سے رہو نا! ان سے یہ نہیں ہو سکتا! اگر چین سے نہیں بیٹھ سکتے تو ہر وقت دوسروں کو دق بھی کرو یہ نا خلف تو میرے سامنے ہر وقت آئینہ لئے کھڑا رہتا ہے۔ ساری دنیا میری

100
www.taemeernews.com

تعریف کرتی ہے۔ میرا نام مثال کے طور پر فخریہ لیتی ہے۔ اور میری زندگی کو ناکارہ' بیکار اور فضول سمجھتے ہیں تو میرے صاحبزادے! ان کو کیا معلوم مصیبت کس کو کہتے ہیں؟ جیل کیا ہوآئے کہ حج کر آئے۔

"میں نے تیرہ سال کی عمر سے کام شروع کیا ہے۔ خود پڑھتا تھا، چھوٹے بھائی کو پڑھاتا تھا۔ بڑی مشکل سے انٹرنس کر کے تیس روپیہ کی نوکری کی تھی۔ جب اس کو کھڑیا کو چھوڑ کر ہم دالان والے گھر میں گئے تھے تو اماں نے بے اختیار مجھ کو بٹھا لیا تھا۔ اور میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اماں تم کو محل میں بٹھا کر دوں گا۔ صاحبزادے فرماتے ہیں۔ ان دو عورتوں کے دل سے تو پوچھئے جو آپ کے ہاں غلامی کرتی ہیں۔"

"واجد! واجد! ارے بھئی ابراہیم سے کہا تھا کہ ابھی تک یہ نہیں آیا۔؟"

"ابراہیم تو ادھر ہے نہیں؟"

"تو بھئی تم ہی جا کر لا دو۔"

"مجھ کو لیڈی صاحب کا حکم ہے کہ اس وقت کہیں نہ جایا کروں۔"

"خود نہیں جا سکتے تو کیا ابراہیم کو نہیں ڈھونڈھ سکتے!" ذکیہ نے واجد کو ڈانٹا۔

"سعید بھائی میں آپ کی جگہ ہوتی تو کبھی اتنے دن یہاں نہ رہتی۔ نوکر تک آپ کی عزت نہیں کرتے۔ سچ مچ آپ بہت بے عزت ہیں ..... ابھی حامد بھائی کہتے تو ....."

سعید ہنسا۔ "میری اور حامد بھائی کی برابری ہے۔ وہ انعام

101
www.taemeernews.com

اکرام دیتے رہتے ہیں۔ وہ کلکٹر ہیں؟

"تم کو کلکٹر ہونے کو کس نے منع کیا تھا۔ سر عطاء اللہ بیگ نے اپنے خیالوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ اسی دن کے لئے مصیبت اٹھائی تھی کہ میرے بچے خوشحال رہیں۔ دنیا میں ان کی عزت ہو۔ ایک کلکٹر ہے، دوسرا کپتان پولیس ہے تو کتنا میرا دل خوش ہوتا ہے۔ اس کو بھی یہ ناہنجار کہتا ہے کہ میں نام کے لئے مرتا ہوں۔ چندے بھی اسی لئے دیتا ہوں۔ اماں کے لئے نوکر انیاں بھی اسی لئے رکھتا ہوں۔ مجھ میں انسانی ہمدردی نہیں۔ کل میں غصے میں فیاض کو ایک تھپیڑ مار بیٹھا تو میری جان کے پیچھے پڑ گیا۔ اب نوکروں پر بھی ہمارا حق نہیں؟ نوکر نہ ہوئے ہمارے آقا ہو گئے؟ اب نوکروں کو بھی نہ پیٹیں تو پھر کام کیسے چلے۔

ہم نے کیا کیا مصیبت نہ اٹھائی۔ افسروں کے کیا کیا نخرے سہے ہیں۔ کیا کیا حرکتیں ان کے خوش کرنے کو نہیں کیں۔ بہت سی باتیں تو ایسی کی جاتی ہیں کہ انسان خود اپنے سے اعتراف نہیں کر سکتا۔ اور جو ایسی باتیں نہ کرو تو پڑے رہو گڑھے میں۔ اگر میں نے بے ایمانیاں کی ہیں اور ہر قسم کی ذلیل حرکتیں کیں تو کس کے لئے۔ اسی لئے نا کہ آگے چل کر میں اور بچے آرام سے رہیں۔ تو آنکھ میں آنکھ ڈال کر کہتا ہے.....

ایک موٹر دفتر کی کھڑکی کے نیچے آکر ٹھہر گئی اور سر علی بیگ کے بڑے لڑکے اتر پڑے "ارے بھئی سعید یہ اسباب کس کا ہے"۔

"میرا ہے"۔

"کیوں بھئی سعید کہیں جا رہے ہو؟"

"جی ہاں!"

www.taemeernews.com

"کہاں ؟"

"پارٹی آفس"

"ارے میاں تم بھی کس وبال میں پڑے ہو۔ چھوڑو یہ قصہ۔ پھر کہیں جیل دیل نہ چلے جانا۔"

سعید ہنسا! "مجھ کو تو جیل جانے کا شوق نہیں۔ باہر رہ کر کام کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو آپ افسروں کی مہربانی ہے جب چاہیں بھیج دیں۔"

جج صاحب باہر کی باتیں سن کر دل ہی دل میں کہنے لگے۔ "جی ہاں بجا ہے۔ ضد اور حماقت کی کوئی حد ہے۔ ہزاروں کو ہر سال جیل خانے بھیج دیتا ہوں۔ میری ایک قلم کی جنبش سے لوگ پھانسی کے تختہ پر لٹک جاتے ہیں۔ میری توہین کی حد ہے یا نہیں کہ میرا ہی لڑکا جیل جائے۔ میرا دل تو اب اس کی صورت دیکھنے کو نہیں چاہتا۔ شکر ہے کہ آج جا رہا ہے لیکن مجھے چین کب ملے گا۔ ادھر دادی ہر وقت روئیں گی کہ واپس بلا لو۔ ادھر بیوی صاحبہ لڑیں گی کہ وہ ذکیہ کو کھٹکتا ہے گھر میں نہیں گھس سکتا۔ اب چاہے کچھ ہو میں اس دق کے کیڑے کو ہرگز گھر میں گھسنے نہیں دوں گا۔ اب تو اماں چاہے کچھ کہیں اور ذکیہ چاہے کتنے نخرے بگھارے سعید میاں اب یہاں نہ آنے پائیں گے۔ اگر بلا لو تو کوئی شرمندہ ہو کر تھوڑی آئے گا۔ جو کام کرتا ہے وہی کرتا رہے گا۔ میرے روپیہ کو ملک کا روپیہ کہتا ہے۔ بے دردی سے خرچ کرتا ہے۔ پھر ہر وقت عدالت کرتا ہے۔ میری ہر حرکت کو ترازو کے پلڑے میں تولتا ہے ...... یہ کیا جانے تولنا۔ اس کا تجربہ ہم کو ہے۔ دکانوں پر چھٹانک بھر آٹے کے لئے بنیئے سے لڑنا پڑتا تھا۔ ہر خواہش کو آئندہ کے لئے ملتوی کر دینا پڑتا تھا۔

پھر بیوی ملی! اُف کتنی بری ایک دن میری طبیعت اس سے نہ لگی۔ یہ

103
www.taemeernews.com

سعدیہ بالکل اپنی ماں کا نمونہ ہے۔ جتنی خواہش مجھ کو ترقی کی تھی اتنی ہی لاپرواہ وہ تھی لوگ کہتے تھے وہ خوش قسمت ہے۔ اس کے آتے ہی میری وکالت چمکنے لگی تھی لیکن اس کو پرواہ ہی نہ تھی۔ روپیہ سے محبت ہی نہ تھی اس کے مرنے کے بعد کتنی شکلوں سے صغرا سے شادی ہوئی ہے۔ جو کہیں آج وہ زندہ ہوتی تو یہ پوزیشن کیا اس پر جچتا؟ یا "لیڈی صاحب" اس پر سجتا؟ توبہ کرو۔ توبہ۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جج صاحب نے ماتھا سکیڑ کر ریسور ہاتھ میں لیا اور کہا "ہیلو! کون ہے!

"عارف! کون عارف؟"

"اچھا آپ ہیں! مولوی سید حسن کے لڑکے!"

"ہاں آپ آئے تو تھے نا۔ اس دن!"

"آپ اب سب انسپکٹر ہیں نا؟"

"ہاں مجھ کو یاد آگیا۔"

"آپ نے ذکر تو کیا تھا اپنے لڑکے کی شادی کا"۔

"لیکن ابھی مجھ کو تو معاف کردو۔ میں نہیں آسکوں گا۔"

"پانچ منٹ کو بھی نہیں۔ یہاں میرے ہاں آج ڈنر ہے۔ میں نہیں آسکتا۔"

"ہاں ہاں۔ مجھے بہت خوشی ہے۔ میری طرف سے مبارک باد قبول کرو"۔

"نہیں میں نے وعدہ تو نہیں کیا تھا۔ یہ کہا تھا کہ فرصت ہوئی تو آجاؤں گا۔"

"ہاں حامد آئے تو ہوئے ہیں لیکن ان کا بھی ڈنر پر موجود ہونا ضروری ہے...

اچھا خدا حافظ۔"

104
www.taemeernews.com

آنکھ اونچی کی تو بڑا لڑکا حامد سامنے کھڑا تھا ہنس کر پوچھنے لگا ۔
"یہ کون ذاتِ شریف تھے ؟"
"ایک مولوی سید حسن کسی زمانے میں ہمارے ہمسایہ میں رہتے تھے ۔ انھوں نے بچپن میں مجھ کو قرآن شریف بھی پڑھایا تھا ۔ ان کے چھوٹے صاحبزادے ہیں ۔ کانسٹبل سے بڑھ کر اب سب انسپکٹر ہوئے ہیں ۔ لڑکے کی شادی ہے ۔ تین چار بار آکر دعوت کر چکے ہیں اور اب ٹیلیفون ....."
نہ معلوم یہ لوگ اتنے کوڑھ مغز کیوں ہوتے ہیں ۔ خود ہی کیوں نہیں سمجھ جاتے ۔ جو فضول دوسروں کو جھوٹ بولنے پر مجبور کرتے ہیں ۔ بھلا سوچیے ! چیف جسٹس صاحب چلے جا رہے ہیں ۔ ایک کانسٹبل کے لڑکے کی شادی میں ۔ کوئی تک بھی تو ہو ؟"
جج صاحب نے اپنے ہونہار بیٹے کی طرف دیکھا جو خدا کے فضل سے اپنے ضلع کا کلکٹر تھا ۔ چھ لاکھ پر حکومت کرتا تھا اور اب چار روز کی چھٹی لے کر باپ سے ملنے آیا تھا ۔ اس کی آنکھوں سے باپ کے لئے محبت اور ہمدردی ٹپک رہی تھی ۔ اس نے باپ کو جھوٹا ، غدار یا بیکار اور فضول ظاہر نہ کیا تھا ۔
اگلے کی گھڑ گھڑاہٹ سنائی دی اور ساتھ ہی بلاٹنگ پر نظر پڑی جہاں پنسل کے نشانوں کے درمیان جج صاحب یہ لکھ گئے تھے ۔" وہ ناہنجار کہتا ہے کہ میری زندگی بے کار ہے ۔ بیکار ہی نہیں شروع سے آخر تک صفر ہی صفر ہے ۔"
پھر حامد کی طرف نظر اٹھائی اور بولے ۔" سعید صاحب تشریف لے جا رہے ہیں جیسے کہ مجھ پر کوئی احسان فرما رہے ہوں ۔ بے کار ۔ فضول

105
www.taemeernews.com

کسی مصرف کا نہیں رہا۔

حامد نے بزرگانہ انداز سے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "غلط صحبت ....."

جج صاحب نے سر ہلا کر اپنے لائق بیٹے کی ہمدردی قبول کی۔

سنہ ۱۹۴۶ء

www.taemeernews.com

آصف جہاں کی بہو

آصف جہاں کے شوہر ایک بہت پیسہ والے ڈپٹی کلکٹر تھے اور ان کا اکلوتا لڑکا نورالحسن کئی بچوں کے مرنے کے بعد جیا تھا۔ سب ہی کا لاڈلا تھا۔ ایسے کنبہ میں تو کوئی ایسا نہ تھا جو خوشی سے اپنی بیٹی نورالحسن کو نہ دے دیتا لیکن آصف جہاں کی آرزو تھی کہ کبریٰ کی لڑکی اپنے بچے کے لئے لائیں۔ وہ ایک حق پرست بیوی تھیں۔ کبریٰ کی لڑکی اس لئے لینا چاہتی تھیں کہ کبریٰ ان کی چھوٹی نند بھی تھیں اور سگی بھاوج بھی اپنی انھیں دور اندیشیوں کی وجہ سے تو وہ خاندان میں ہر دلعزیز تھیں۔ اگر نورالحسن کی منگنی میکہ میں کرتی تھیں تو سسرال والے منہ بناتے اور جو سسرال میں کرتیں تو میکے والے رنجیدہ ہوتے۔ اب اگر کبریٰ کی لڑکی ہوتی تو سسرال اور میکے دونوں خوش رہتے۔

ویسے تو کبریٰ بیگم کے ماشاء اللہ ہر سال سوا سال کے پیچھے بچہ ہوتا تھا اور پچیس سال کی عمر میں پانچ بیٹوں کی اماں تھیں۔ سارے کنبے میں ان کی خوش

www.taemeernews.com

قسمتی ضرب المثل تھی ۔" خدا نصیبا کرے تو کبریٰ کا سا ۔ جب دیکھو لڑکا ہی گود میں دیکھو اور بیٹی تو بوا خدا دشمن کو بھی نہ دے "۔

جب کبریٰ کے ہاں ایک اور لڑکا ہوتا ساری دنیا رشک کرتی ہاں اگر رنج کسی کو ہوتا تھا تو وہ آصف جہاں تھیں۔ گو وہ کبریٰ بیگم کی صحت یابی سے خوش ضرور ہوتی تھیں۔ آخر کو جنا اور مرنا برابر ہی ہے۔ لیکن پھر بھی جب کبریٰ بیگم کے لڑکا ہوا آصف جہاں رو دیں۔" اس میں کسی کا کیا قصور ہے میری قسمت ہی خراب ہے۔ نو بچوں میں ایک نورالحسن کا منھ دیکھا ہے۔ اور اس کے لئے بھی میری تمنا پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ جدھر دیکھو بیٹیاں ہی بیٹیاں بھری پڑی ہیں۔ بر تک نہیں جڑتے لیکن میرے بچے کے لئے اللہ میاں دلہن ہی نہیں بھیجتے "۔

کبریٰ بیگم تین دن سے دردزہ میں مبتلا تھیں۔ خاندانی بڑھیا دائی بیٹھی ہوئی تھی۔ گھر بڑی بوڑھیوں۔ بہنوں، بھاوجوں، دیورانیوں، جیٹھانیوں نندوں اور ان کے بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس غضب کا شور مچا ہوا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ شادی کا گھر معلوم ہو رہا تھا۔ عورتوں میں آپس میں صلاحیں ہو رہی تھیں کہ ڈاکٹرنی کو بلایا جائے یا نہیں۔ درد پہ درد تو چلے آ رہے ہیں اور بچہ ہے کہ کھسکنے کا نام نہیں لیتا۔" بچے سبھی کے ہوتے ہیں لیکن بوا ایسا بچہ نہ دیکھا نہ سنا" صدقہ کا بکرا۔ غریبوں کو اناج۔ تعویذ۔ گنڈے غرضیکہ ہر چیز ہو رہی تھی لیکن بچہ ٹس سے مس نہ ہوتا تھا ادھر کبریٰ بیگم دردوں کی تکلیف سے نڈھال ہو رہی تھیں ادھر باہر تخت پر آصف جہاں جائے نماز پر بیٹھی ہاتھ پھیلائے خدا سے دعا مانگ رہی تھیں۔ اے رب العالمین! کبریٰ کے چھوٹے چھوٹے بچوں پر رحم کر اور اس کی اس مصیبت سے چھٹی دے اسے میرے مولا اس دفعہ میری سن لے اور کبریٰ کی گود میں میری بہو بھیج دے۔ اے پروردگار پانچ بار تیرے حضور سے مایوس لوٹی ہوں اس دفعہ میری مراد ..... آصف جہاں دعائیں

www.taemeernews.com

مانگتی جاتی تھیں۔ ان کے چہرے سے خدا کے رحم کی توقع پوری طور سے ٹپک رہی تھی ـــ

کبریٰ بیگم کے کراہنے اور چیخنے کی آوازیں برابر آصف جہاں کے کان میں چلی آرہی تھیں " ہائے آپا! ـــ اچھی میری بھابی جان ..... اب کے نہیں بچوں گی۔ اللہ ..... اللہ ...... میرے حال پر رحم کر .... مری ہائے مری ......

"اے ہے کبریٰ ایسی بدفالیں منھ سے نہ نکالو ....."

"پانی ...... ہائے پانی ......"

"گل شبو ـــ اری او گل شبو کہاں مرگئی ... اری کم بخت کٹورا تو دیکھ خالی پڑا ہے ـــ" ایک رشتہ دار اندر سے چیخیں۔

تھوڑی دیر بعد کبریٰ بیگم کی چیخیں اور بڑھ گئیں۔ اور ساتھ اور عورتوں کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ شاباش ہے شاباش ہے۔ لگاؤ زور ... اور زور۔ بس .... پھر ایک ایسی بھیانک چیخ کبریٰ بیگم کی سنائی دی کہ آصف جہاں کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ اور یہ چند سیکنڈ جو گزرے تو انھیں برسوں کے برابر معلوم ہوئے۔ پھر ایک بچے کی ہیاؤں ... ہیاؤں رونے کی آواز سن کر انھوں نے چین کا سانس لیا۔ اور اپنی دعا اس طرح ختم کی "اے میرے مالک لڑکا ہو یا لڑکی یہ تو میری قسمت ہے۔ لیکن شکر ہے تیرا کہ تو نے کبریٰ کی جان بچائی ......" یہ کہہ کر سجدے میں گر پڑیں۔ ابھی اٹھنے نہ پائی تھیں کہ ایک چھوکری بھاگتی ہوئی آئی "لڑکی ہے لڑکی .... بیگم صاحب دلہن مبارک ......"

سجدے ہی میں آصف جہاں کی باچھیں کھل گئیں۔ جلدی سے سر اوپر اٹھا

109
www.taemeernews.com

کرکے انگیا میں سے بٹوا نکالا اور ایک روپیہ چھوکری کے ہاتھ پر رکھ کر خوش خوش زچہ خانہ کی طرف بڑھیں۔ اس کمرے میں پہلے ہی سے عورتوں کی کافی بھیڑ تھی۔ ہر قسم کی شادی شدہ عورت موجود تھی۔ سب کے چہروں پر اب تشویش بہت کم ہو گئی تھی۔ آصف جہاں کے گھسے ہی ایک بیوی بولیں "ابھی آنول نہیں گری ہے"۔

زچہ کے پلنگ پر سرہانے کی طرف کبریٰ کی پھوپھی اور بڑی بہن ایک بھاوج بیٹھی تھیں اور پائینتی کی طرف دائی اپنے پاؤں کبریٰ کی رانوں سے اڑائے بیٹھی تھی۔ بھاوج اٹھ کر عورتوں کے برابر کھڑی ہو گئیں۔ اور اپنی جگہ آصف جہاں کے لئے پلنگ پر چھوڑ دی۔

"بھابی جہاں کبریٰ نے اس دفعہ بڑی تکلیف اٹھائی۔ لیکن آپ کی قسمت سے اب کے لڑکی ہوئی ہے۔ ماں کی تو جان پر بن گئی تھی۔ کبریٰ کی بہن نے آصف جہاں کو مخاطب کر کے کہا۔

"تمھاری سب کی دعا خدا نے سن لی۔ میں تو اس دفعہ بھی بے آس ہو چکی تھی ..... یہی اچھا ہوا کہ اللہ نے اپنا فضل کر دیا اور میم کی نوبت نہ آئی ....."

"بس بیوی کچھ نہ پوچھو ..... تم بیویاں تو چھوٹے موٹے ہاتھ پاؤں پھلا دیتی ہو۔ بچہ تو جبھی ہوگا جب اللہ کا حکم ہوگا۔ میم آ کر کیا بنا لیتی۔ الٹے سیدھے اوزار ڈالنے شروع کر دیتی۔ ذرا دیر ہوئی تو کہنے لگتی ہو۔ میم کو بلواؤ۔ میم کو بلواؤ۔ جب یہ انگریزی میمیں نہ تھیں تو کیا کوئی عورت بچہ ہی نہ جنتی تھی ....." دائی نے جلے ہوئے لہجہ میں زور زور سے بڑبڑانا شروع کیا۔

"اے ہے دیر کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ دو راتیں اور تین دن گزر گئے

110 www.taemeernews.com

راتوں درد میں تڑپیں اور تم کو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ بچہ کب ہوگا؟ کیا ہم نے بچے نہیں جنے کیا ہم نہیں جانتے۔" کبریٰ کی بہن عائشہ بیگم نے جواب دیا۔

"اچھا اب باتیں تو بنا چکیں۔ یہ بتاؤ آنول کب گرے گی؟"

"بیوی موت زیست خدا کے ہاتھ ہے۔ وقت کی کسی کو خبر نہیں ہے بچہ ہوگیا ابھی ڈنڈی میں جان ہے اے دیکھو کیسی پھڑک رہی ہے۔"

دائی ایک ہاتھ سے جو چاندی کی میلی کچیلی انگوٹھیوں، چوڑیوں سے بھرا ہوا تھا۔ آنول کی ڈنڈی پکڑے ہوئے تھی اور دوسرے ہاتھ سے میلا صاف کر رہی تھی۔ عائشہ بیگم زچہ کا پیٹ نہایت زور سے دبائے ہوئے تھیں۔ یہ اپنے پیٹ پکڑنے کے لئے کنبہ بھر میں مشہور تھیں۔

"دلہن درد آیا؟" دائی نے زچہ سے پوچھا۔

"نہیں" کبریٰ نے ایک نحیف اور کمزور آواز میں جواب دیا۔

"ڈنڈی کی پھڑک تو اب بہت کم رہ گئی ہے۔" یہ کہہ کر دائی نے ڈنڈی کو پاؤں کے انگوٹھے اور الٹے ہاتھ سے پکڑ کر سیدھے ہاتھ سے اس کو سونتنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ بالکل سفید بے جان ہونے لگی۔

"اے ہے مبتن ابھی سے نال نہ کاٹ دینا ابھی تو آنول نہیں گری ہے۔" کھڑی ہوئی جماعت میں سے ایک نے کہا۔

"اے بیوی کل کی بچی ہو۔ میرے ہاتھ کی پیدا اب مجھی کو پڑھانے لگیں۔ میرا جونڈا کیا دھوپ میں سفید ہوا ہے۔ بڑی بیگم خدا کی قسم یہ لڑکیاں اچھے خاصے بھلے آدمی کو الو بنا لیتی ہیں۔ میں ایسی پاگل ہوں کہ نال آنول گرنے سے پہلے کاٹ دوں گی۔"

مبتن آنول سونتتی رہی اور دوسری عورتیں اپنے قصے بیان

111
www.taemeernews.com

کرنے لگیں کہ ان کی اپنی دفعہ کیا ہوا تھا۔ اور محلہ بالان کے سسرال میں کون دائی آئی ہے اور فلانی زچہ بچہ کو پیدا ہوتے ہی مرگئی۔ اور آنول اندر کی اندر رہ گئی۔

"عاشق حسین کی دلہن کا کیا ہوا۔ آنول نہ گری۔ شام ہوگئی۔ دائی نے بہتیری کوشش کی۔ آخر کو ہار کر اس نے بھی کہہ دیا کہ آنول تو کلیجہ میں چپک کر رہ گئی ہے۔ اب میرے بس کی نہیں۔ بیماری کو ہسپتال لے گئے۔ وہاں میموں نے نکالی۔ لیکن بُوا سنا ہے کہ کلیجہ بھی ساتھ ہی نکل آیا۔ تین دن میں مرگئی۔ دو چھوٹے چھوٹے بچے ....."

"میری نند کی آنول بھی ڈاکٹرنی نے آن کر نکالی۔ بیمار تو وہ بہت ہوئیں لیکن بچ گئیں"۔

دائی "ڈاکٹرنیوں" میموں کے نام سن کر خاموش نہ رہ سکی۔ ایک دم جھنجھلا کر بولی۔ "کسی کی ایسی زبان ہو۔ یہ وقت، ایسی بد فالیں نکالنے کا ہے۔ میم، ڈاکٹرنی کوئی بات ہی نہیں۔ ارے ذرا دیکھو تو بڑی بیگم!....."

"اے ہاں سچ تو ہے۔ قیصر! اس وقت تو کوئی اور ذکر چھیڑو"۔ بڑی بیگم نے کہا۔

"اے ہاں" دائی نے کھج کر کہا: "عائشہ بیوی دباؤ بھینچ کر پیٹ کو! وہ آنول آرہی ہے! عائشہ بیگم جو پیٹ کو پہلے ہی زور سے دبائے بیٹھیں مٹھیاں بھینچ آدھی کھڑی ہو کر پورا دم لگا کر بہن کا پیٹ بھینچنے لگیں۔ زچہ تڑپ گئی اور چیخ پڑی۔ ہے ہے آپا خدا کے لئے بس کرو۔ میرا تو دم نکلا..!

اے بس لو چھٹی ہوئی"۔

دائی نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ "اے لو بڑی بیگم دیکھ لو۔ پوری ہے

112
www.taemeernews.com

پوری پھر بعد میں نہ کہہ دینا۔" یہ کہہ کر اس نے آنول آصف جہاں کی طرف بڑھائی اور پھر جتنی عورتیں تھیں سب نے باری باری دیکھی اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"اے ہے بیوی! ابھی سے پیٹ ڈھیلا نہ کرو۔ خون بہت نکل رہا ہے ذرا کس کے پکڑے رہو!" دائی نے کہا۔ عائشہ نے بھرپور زور لگا دیا۔

"نال کاٹ لوں۔ اتنے میں خون رک جائے گا۔" یہ کہہ کر پھر پاؤں کے انگوٹھے سے ڈنڈی پکڑی اور اس کو پھر زور زور سے سوتنا شروع کیا پھر ایک کچے ڈورے سے جو پاس ہی پلنگ پر بڑی دیر سے پڑا تھا۔ نال باندھ کر پھر اِدھر اُدھر نگاہ پھیر کر ایک زنگیا ہوا چاقو نیچے سے اٹھا کر نال کاٹ دی۔ آنول کونڈے میں ڈالی۔ گودڑ زچہ کے نیچے سے نکال کر اس کو صاف کیا خون اب بھی زیادہ مقدار میں جاری تھا۔ مسیتن اب ایک فاتحانہ انداز سے پلنگ سے اتریں۔ کھڑے ہو کر ایک انگڑائی لی۔ "اے ہے بڑی بیگم تم سے ہٹ جاؤ تم سے یہ نہیں اٹھیں گی۔ صابرہ بیوی تم اور قیصرہ آجاؤ۔" صابرہ اور قیصرہ نے نیچے ہاتھ ڈالا اور زچہ کی ہائے دائے کی پرواہ نہ کر کے اس کی کمر کو کوئی آٹھ انچ اونچا اٹھا لیا اور مسیتن نے ایک چھ گز لمبی پٹی کو زچہ کے پیڑو پر ادھر سے ادھر لپیٹنا شروع کیا۔ خون اب کچھ کم ہو گیا تھا۔ لیکن کبریٰ آپا ایک دھلے ہوئے کپڑے کی مانند سفید اور دھجی کی طرح لاغر ہو چکی تھیں۔ بچہ ہو گیا۔ آنول نچڑ گئی۔ اب اللہ اپنا فضل کرے گا۔ تو طاقت بھی آجائے گی۔

اب آصف جہاں بچی کی طرف متوجہ ہوئیں اور لڑکی کا منھ دیکھا اور بولیں "سانولی ہے!"

www.taemeernews.com

"اے شکر کرو۔ بھابی جان کہ تمھارے نصیب سے لڑکی ہی ہو گئی۔"

"اے اس کا کیا ذکر ہے اگر کانی بھی ہوتی تو کیا میں چھوڑ دیتی۔ اے مستین اب بچی کو نہلاؤ گی یا نہیں!"

مستین نے بچی کو نہلایا اور آصف جہاں کے اصرار پر لڑکی کو ان کو دینے سے انکار کر دیا۔ "بیوی بڑی منتوں کی ہے۔ میں یوں نہ دوں گی۔ میرا حق پہلے دو۔"

"اے لو۔ یہ کون سا نیا دستور تم نے نکالا ہے جو تمھارا حق ہے وہ میں پہلے ہی آنول کے کونڈے میں ڈال چکی۔۔۔۔۔"

مستین دانت بھاڑ کر بولیں۔ "اللہ قسم۔ اچھا کیا ہے!"

"پانچ روپیہ ہیں اور کیا ہوتے؟"

"خدا کی قسم بڑی بیگم۔ پانچ روپیہ تو میں ہرگز نہیں لوں گی۔"

"اے کچھ دیوانی ہوئی ہو مستین۔ لوگ تو کونڈے میں منگنی کا ڈلا ڈالتے ہیں۔ یہ کوئی نیگ کا وقت ہے۔ جب بیاہ ہوگا تو لینا۔"

ہاں بیوی ٹھیک کہتی ہو!" میں ان کے بیاہ تک تو ضرور جیتی رہوں گی۔ تم بیویاں چاہے لاکھ اٹھا دو لیکن حقداروں کو دیتے ہوئے ہمیشہ قانون چھانٹتی ہو۔ بھگن لے لے۔ گل شبو لے لے۔ جس کا دل چاہے لے لے۔ میں تو بیوی یہ پانچ روپیہ ہرگز نہ لوں گی۔"

مستین ان کی خاندانی دائی تھی۔ سب اس کے ہاتھوں کے پیدا تھے لڑ جھگڑ لیتی تھی۔ آصف جہاں نے بٹوہ کھول کر دو روپیہ اور ڈال دیئے مستین جس کو پانچ کی اور امید تھی۔ دو لے کر کچھ زیادہ خوش تو نہ ہوئی۔ ہاں سب دھو کر اپنے بٹوے میں رکھ لئے۔ پھر جتنی بیویاں وہاں موجود تھیں

www.taemeernews.com

سب نے کچھ نہ کچھ میستن کو دیا۔ کسی نے اٹھنی کسی نے روپیہ۔ میستن نے کونڈا اٹھاکر کبریٰ بیگم سے کہا۔ "دلہن خدا کی قسم یہ بیٹی بیٹوں سے زیادہ منتوں مرادوں کی ہے۔ خدا کی قسم سونے کے کڑے لئے بغیر میں نہ مانوں گی۔

"اے واہ کبریٰ نے کس دن لڑکی کی منت مانی تھی۔ جو لینا ہے بھابی جان سے لو جنھوں نے بہو کے لئے منتیں مانی تھیں۔ ہم تو وہی دیں گے جو اور بیٹوں کی پیدائش پر تم کو ملتا ہے"۔ عائشہ بیگم نے میستن کو جواب دیا۔

"سن رہی ہو بڑی بیگم!" میستن نے آصف جہاں کو مخاطب کیا۔

"اے اب تم جاؤ نہ ہاتھ منہ دھو۔ پان وان کھاؤ۔ مٹھائی توس لاؤ۔ لاؤ کی پڑی رہتی ہے......" عائشہ بیگم نے تڑخ کر میستن سے کہا۔

عائشہ بیگم بہت طرار تھیں۔ بہو سے فارغ ہوکر انھوں نے ڈومنیوں کو بلا بھیجا۔ گھر میں شور وغل کی پہلے ہی کیا کمی تھی۔ اب تو ڈھول اور گانے نے ایک کہرام مچادیا۔ چھیڑ چھاڑ شور وغل میں زچہ کے آرام و نیند کا کسی کو بھی خیال نہ تھا۔ سب عورتیں آصف جہاں اور آپس میں ایک دوسرے کو چھیڑتی رہیں۔ ڈومنیوں سے زچہ گیریاں۔ سہاگ گالیاں سب کچھ گوایا۔ زچہ خانے کی تعلیں ڈومنیاں بیٹھ بھلا بھلا کر کر رہی تھیں۔

"اے جی کون سا لاگا؟" ایک جو میاں بنی تھی سوال کرتی تھی اور بیوی "ساتواں لاگا یا آٹھواں لاگا" میں جواب دیتی تھی۔ کنواری لڑکیاں جو بچہ کے پیدائش تک ایک دوسرے دالان میں جمع کردی گئیں تھیں۔ اب آزادی سے سارے گھر میں آجا سکتی تھیں۔ بیویوں کا تو کہنا ہی کیا۔ اکثر لڑکے بھی دیوان خانے میں آکر جمع ہوگئے تھے۔ ۱۲ سال کے دولھا صاحب بھی انھیں بچوں کے جھرمٹ میں سے پیچھے آدھے ڈھکے بیٹھے سب سن رہے تھے کہ

115
www.taemeernews.com

ان پر ان کی ایک رشتہ کی بہن کی نگاہ پڑی۔ انھوں نے لپک کر انھیں پکڑ لیا۔ "لو دیکھو دولھا صاحب بھی خیر سے مٹھے سنور رہے ہیں۔" ایک قہقہہ پڑا۔ دولھا صاحب نے گرفت چھڑانے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ "چھوڑ دیجئے باجی، چھوڑ دیجئے ہمیں"۔ جب وہ ڈیوڑھی کی طرف بھاگنے لگے تو باجی ان کے پیچھے زور سے چلائیں۔

"اے کیسے دولھا ہو ذرا اندر چل کر تو دیکھو کیسی چاند سی دلہن ہے"

www.taemeernews.com

۵۹

میری اس سے شفاخانے میں ملاقات ہوئی۔ وہ بھی دوا لینے گئی تھی اور میں بھی۔ اس کو دیکھ کر سب عورتیں ہنسنے لگیں۔ ڈاکٹر نے بھی اپنی کراہت کا اظہار آنکھیں بند کر کے کیا۔ گھن تو مجھ کو بھی آئی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح سے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ بھی مسکرائی کم از کم کوشش تو کی۔ اس کی ناک سرے سے غائب تھی۔ اور دو بڑے بڑے لال لال سے چھید اس کی ناک کی جگہ پر تھے۔ ایک آنکھ بھی نہ تھی۔ اور دوسری سے بھی بغیر گردن کے سہارے نہ دیکھ سکتی تھی۔

اور پھر تھوڑی دیر بعد دوا خانے کی کھڑکی پر میری اس سے مڈبھیڑ ہوئی۔ اس نے غن غنا کر مجھ سے پوچھا۔ "آپ کہاں سے تشریف لائی ہیں" میں نے اپنا پتہ بتا دیا۔ وہ دوا لے کر چلی گئی۔ اور مجھ کو کمپونڈر نے بغیر میرے پوچھے بتانا شروع کر دیا۔ "یہ بدمعاش عورت ہے۔ رنڈی ہے رنڈی۔ سڑ سڑ کر مر رہی ہے۔ اب آئی ہے علاج کرانے۔ ڈاکٹر کا تو دماغ خراب ہے کہ نسخہ لکھ دیتی ہے۔

نکال باہر کریں سسری کو!"

میں ایک لڑکیوں کے اسکول میں استانی تھی نئی نئی کالج سے نکلی تھی دنیا میرے قدموں سے لگی تھی مستقبل میرے سامنے مثل چمن کے تھی اور جس کا ہر پودا گلاب اور چنبیلی سے کم نہ تھا مجھ کو ساری دنیا ایک چاندنی رات اور اس میں دریا کا بہاؤ جو کہیں نرم خرام اور کہیں آبشار معلوم ہوتا تھا۔ میں خوش تھی۔ تکلیف غم میں جانتی ہی نہ تھی کیا ہوتے ہیں۔ پڑھانا بھی وقت کاٹنے کا بہانہ تھا ساری خودی اس زمانے میں ایک انتظار تھی۔

چلمن اٹھی اور وہ کالج کے دفتر میں داخل ہو رہی تھی۔ میں حیرت سے کھڑی ہو گئی۔ اور بغیر سوچے سمجھے عادت کے مطابق بول اٹھی "تشریف رکھئے"۔ پہلے تو وہ جھجکی اور پھر بیٹھ گئی اس کے ہاتھ میں ایک موتیا کا پھول تھا۔ اس نے میز پر میرے سامنے رکھ دیا۔ مجھ کو اس پھول کو اٹھاتے ہوئے گھن ضرور آئی لیکن اپنے اوپر جبر کر کے اس کو اپنے بالوں میں لگا لیا۔ وہ مسکرائی اور اٹھ کر چلی گئی۔

اب یہ روز کا معمول تھا۔ وہ روز چھٹی کے وقت چلمن اٹھا کر اندر آتی۔ میں کہتی تشریف رکھئے۔ وہ بیٹھ جاتی۔ کوئی نہ کوئی پھول میرے سامنے رکھ دیتی۔ میری ہم عمر استانیاں اس کے لئے چھیڑتیں۔ جس کرسی پر وہ بیٹھتی تھی اس پر کوئی نہ بیٹھتا تھا۔ اس کی صورت ہی ایسی گھناؤنی تھی۔ میں خود اس کرسی کو کبھی نہ چھوتی تھی۔ بڑھیا نصیبا بھی روز اس کے جانے کے بعد بڑبڑایا کرتی تھی۔ "یہ نئی استانی اچھی آئی ہیں۔ اس گندی سندری کو منہ لگا لیا ہے۔ ہم اس کی کرسی کیوں جھاڑیں۔"

پرنسپل بھی ناک بھوں چڑھاتیں۔ اور کہتیں۔ "تم اس کو یہاں اسکول میں کیوں بلاتی ہو؟ یہاں لڑکیوں کے ماں باپ ضرور اعتراض کریں گے۔ کہ

www.taemeernews.com

ایسی فاحشہ عورت آجاتی ہے"۔ دوسرا دن ہوتا اور پھر وہ آجاتی۔ اور میں پھر کہتی ۔ "تشریف رکھئے"۔ اب وہ ذرا دیر تک بیٹھتی اور میری طرف دیکھتی رہتی ۔ ہماری کبھی باتیں نہیں ہوئیں ۔ کیا یہ سمجھتی ہے کہ مجھ کو اس کی حقیقت کا علم نہیں ؟ وہ صرف دیکھتی رہتی ۔ اسی اپنی ایک ٹیڑھی سی آنکھ سے اور بغیر ناک والے گھناؤنے چہرے سے ۔ کبھی کبھی مجھ کو شبہ ہوتا کہ اس کی آنکھ اشک آلود ہے ۔ وہ کیا سوچتی رہتی ہے ۔؟ میرا دل چاہتا کہ پوچھ لوں ۔ لیکن کہاں سے شروع کرتی ؟

اکثر تو یہ ہوا کہ جہاں وہ آئی اور استانیاں اٹھ کر چل دیتیں اور انگریزی میں مجھ کو دق کرتی رہتی تھیں ۔ "صفیہ کی وہ آئی ہیں بھئی چلو لائبریری میں بیٹھیں گے ۔ کم بخت کی شکل تو دیکھو!

کوئی کہتی "بھئی صفیہ اس منحوس کو دیکھ کر تو مجھ سے روٹی بھی نہیں کھائی جاتی ۔ قے آتی ہے ۔"

"لیکن چینی بھی تو ظالم نے خوب ہے ۔ تم سیاہ میں نمبر ایک"

"اس کمبخت سے تو پردہ کرنا چاہیے"۔ یہ دینیات کی موٹی بڑھیا استانی جل کر فرماتیں ۔

میں اپنا کام کرتی رہتی اور وہ دیکھتی رہتی ۔ مجھ کو بے چینی ہوتی ۔ کیا دیکھتی ہے ؟ کیا سوچتی ہے ؟ کیا یہ کبھی میری طرح تھی ۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ۔

یہ کیوں آتی ہے ؟ کیا یہ نہیں جانتی کہ لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں اور گھن کھاتے ہیں ۔ اس کی ناک بھی برابر ان لال چھیدوں سے ٹپکتی رہتی ہے ۔ اور میں روز سوچتی اس کو منع کر دینا چاہیے ۔ پرنسپل صاحب ٹھیک تو کہتی ہیں ۔

119
www.taemeernews.com

لڑکیاں الگ بڑبڑاتی ہیں۔ استانیاں قے کرتی پھرتی ہیں۔ لیکن جب وہ دوسرے دن آتی تو میں کرسی پیش کر کے پھر کہتی " تشریف رکھیے "۔

کیا اس کے پاس آئینہ نہیں ہے۔ کیا اس کو معلوم نہیں کہ یہ اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔ کوئی اس کو بتا کیوں نہیں دیتا۔ اس کا کوئی ہے بھی یا نہیں۔ یہ کہاں رہتی ہے۔ کہاں سے آجاتی ہے۔ کیا یہ سمجھتی ہے کہ میں اس کو صرف ایک بیماری سمجھتی ہوں۔ میرا اسکول میں ایک عجیب مذاق بنتا ہے۔ مذاق ہی نہیں ایک توہین سی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ کوئی پھول میرے سامنے رکھ دیتی میں سر میں لگا لیتی۔ اور وہ اپنی بھیانک مسکراہٹ سے مسکرا دیتی۔

یہ مجھ کو کیوں دیکھا کرتی ہے؟ یہ کون ہے؟ یہ کون تھی؟ کہاں پیدا ہوئی اور کیسے اس حال کو پہونچی۔ میرے پاس آکر اس کو کیا محسوس ہوتا ہے۔ ایک تکلیف یا ایک سکون؟

ایک روز جب وہ باہر نکلی تو اس نے جھانک کر ناک چھینکی اور گندگی دیوار سے لگا دی۔ نصیبا جو چھوٹی بچیوں کی تختیوں پر ملتانی مٹی مل رہی تھی اور عرصہ سے خار کھائے بیٹھی تھی۔ ایک دم جوانوں کی سی پھرتی سے اٹھی آکر سیدھی ایک تختی اس کی کمر پر بری اور وہ گھبرا گئی۔ بوا نصیبا وہ سب تہذیب جو انھوں نے اسکول کی بیس سال کی نوکری میں سیکھی تھی۔ اور جو ہمیشہ لڑکیوں کو تمیز دار بننے کی نصیحت کیا کرتی تھیں آج سب بھول گئیں۔ اور وہی گلی والی نصیبا بن گئیں۔ " حرامزادی، رنڈی۔ آئی ہے بڑی کرسیوں پر بیٹھنے۔ دن لگ گئے۔ کل چوک میں بیٹھی تھی۔ آج جو کٹ کٹ کر گوشت گر رہا ہے تو چلی ہے بیگم بننے ۔۔۔۔"۔

ایک لات۔ دوسری لات۔ تیسرا مکا۔

میں بھاگ کر باہر نکلی اور نصیبًا کو پکڑا "ہائیں ہائیں کیا کرتی ہو" لڑکیوں کا ایک ٹھٹ لگ گیا۔ استانیاں بھی بھاگی چلی آرہی تھیں۔ نصیبًا تو اپنے آپے میں ہی نہ تھی۔

"تم نے ہی تو سر چڑھایا ہے کہ موری کی اینٹ چوبارے چڑھی ساری دیوار گندی کر دی۔ بیس سال سے نوکر ہیں۔ ہم نے نہیں دیکھا کہ رنڈیاں اسکول میں آئیں۔ میں ہرگز اب یہاں نہیں رہوں گی۔ بلا لو اور کوئی عورت جو ۔۔۔۔۔" ایک بار بپھر کر اس کی طرف بڑھیں۔ لوگوں نے بڑھیا کو سنبھال لیا۔

میں نے جھک کر اس کو اٹھایا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں پکڑ کر اس کو پھاٹک کی طرف لے گئی۔ اس کی کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا۔ غالباً وہ کنگھی اسے نہ معلوم ہوا تھا۔ روتے میں منہ چھپا کر غوں غوں "اب تو آپ کو معلوم ہو گیا" اور چلی گئی۔

www.taemeernews.com

ساس اور بہو

لو آج صبح ہی سے انھوں نے شور مچانا شروع کر دیا

"اے بہن کیا پوچھتی ہو کہ تمھاری ساس کیوں خفا ہو رہی ہیں۔ ان کی عادت ہی یہ ہے۔ ہر آئے گئے سب کے سامنے میرا رونا لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ساری دنیا کے عیب مجھ میں ہیں۔ صورت میری بری۔ پھوہڑ میں۔ بچوں کو رکھنا میں نہیں جانتی۔ اپنے بچوں سے مجھے دشمنی۔ میاں کی میں بیری۔ غرضیکہ کوئی برائی نہیں جو مجھ میں نہیں اور کوئی خوبی نہیں جو ان میں نہیں۔ اگر میں کھانا پکاؤں تو زبان پر رکھ کر فوراً تھوک دیں گے۔ اور وہ نام رکھیں گی کہ خدا کی پناہ۔ کہ دوسرا کبھی نہ کھا سکے۔ شروع میں تو مجھے کھانا پکانے میں کافی دلچسپی تھی۔ تم جانتی ہو کہ اپنے گھر پر بھی اکثر پکا لیتی تھی اور میری اماں کو اتنا اچھا کھانا پکانا آتا ہے کہ اپنے رشتہ داروں میں ہر جگہ

www.taemeernews.com

مشہور ہیں۔ یہاں تو جو پکایا اس میں برائی نکلی کہ نمک تو دیکھو زہر۔ مزا ایسا کہ متلی کھالو۔ ایک دن خود ہی بڑے پکائے اتنے برے تھے کہ ہمارے سسر نے کہا کہ ایسے واہیات بڑے کس نے بنائے ہیں۔ خوب بڑبڑائیں کہ تم کو تو بس بہو کے ہاتھ کی چیزیں اچھی معلوم ہوتی ہیں ساری عمر بہو تو پکا پکا کر کھلاتی رہی ہے۔ اب میں کیا بولتی۔ خوب سننے کہ تمہارا صبر پڑا۔ میں نے سوچا کہ کام کرو اور باتیں بھی سنو تو اس سے بہتر نہ ہی کرو۔ کھانے پکانے ہی پر کیا ہے۔

سینے پرونے میں جو کبھی کبھار ایک آدھ چیز درزی سے سلوالوں تو بس پھر سنو۔ بہنوں ہر آئے گئے کے سامنے ہوتا ہے کہ ہماری بہو صاحب تو میم صاحب ہیں وہ تو درزی سے سلواتی ہیں ہر چیز اپنی، بچوں کی، ان کے کرتے پاجامے خود ہی سی لیتی ہوں۔ لیکن کبھی کبھار کسی نئی قسم کے بلاؤز یا کوٹ کو دل چاہنے لگے تو درزی کو دے دیتی ہوں۔ چھپا کر دیتی ہوں پھر بھی ان کے اتنے مخبر میرے پیچھے لگے رہتے ہیں کہ ہر بات کی خبر کر ہی دیتے ہیں۔ جب میں نئی نئی آئی تھی تو ان کا ایک چکن کا کرتہ میں نے سی دیا تھا۔ ہر ایک کو دکھایا گیا۔ اور برائی کی گئی۔ جو دیکھے چپ ہو جائے۔ اچھے خاصے کرتے کی کوئی کیسے برائی کردے۔

جب کسی نے برائی نہ کی تو اس کو سارے کو ادھیڑ ڈالا اور پھر کسی اور سے سلوایا۔ دل تو میرا بھی چاہا کہ اب سب کو دکھا دوں۔ لیکن میں یہ کیسے کرسکتی تھی۔ وہ بڑا ہونے اور ساس بننے کا فائدہ اٹھاتی ہیں۔ ہر وقت پڑھا لکھا ہونے کا طعنہ ہے۔ کوئی کتاب میرے ہاتھ

www.taemeernews.com

میں دیکھیں تو جل جاتی ہیں۔ کسی کو خط لکھتا دیکھ لیں تو سمجھتی ہیں کہ انھیں کی برائی لکھ رہی ہوں۔ کوئی بات ہی ان کو میری پسند نہیں اور سب سے بری بات جو لگتی ہے کہ ہم دونوں میاں بیوی کبھی خوش نہ رہیں کبھی اگر یہ کچھ میرے لئے لے آئیں اور خبر ہو جائے تو جل بھن کر رہ جاتی ہیں۔ اور اٹھتے بیٹھتے ان کو طعنہ ہیں کہ "تم تو بیوی کے غلام ہو" ہر وقت میری برائی ان کے سامنے کرتی ہیں۔ وہ سن کر ٹال جاتے ہیں۔ کبھی ماں سے بگڑ بھی جاتے ہیں اور کبھی ہنس کر کہہ بھی دیتے ہیں کہ "ہاں بہت بری ہے۔ اماں میری دوسری کر دو۔" اس وقت تو ان کو باتیں سنائی ہیں کہ "جو تمھارے میں یہ ہمت ہوتی تو یہ سر ہی کیوں چڑھتی۔" اور دوسروں کے سامنے کہتی پھرتی ہیں کہ میرا لڑکا تو اپنی قسمت کو روتا ہے۔ مجھ سے کہتا ہے کہ میری دوسری کر دو۔ وہ تو میں ہی ہوں کہ اپنے بچے پران بیوی کے لئے ظلم کر رہی ہوں۔ کوئی دوسری والی ہوتی تو کبھی کا کر دیتا۔ نہ اس کے ڈھنگ جین ہے نہ اس کے روٹ۔ بچوں کے اوپر لو۔ بالکل ناس ہو گیا ہے جس بات کو میں ہاں کہوں گی یہ نا۔ جس بات کو منع کروں گی یہ ضرور کر کے دیں گی۔ اب باہر کوئی سودے والا پکارے۔ بچے تو ضرور مانگیں گے۔ مجھے یہ سودے والوں سے مکھیوں کا بھنکتا سودا بچوں کو لے کر دینا پسند نہیں میری ضد میں ضرور لے کر دیں گی۔ پچھلے سال برسات میں بڑے لڑکے کو ملائی کی برف کھا کر وہ زور کا بخار چڑھا۔ دو مہینے لیے بیٹھی رہی۔ اس میں کبھی لڑائی کہ بچے کو بھوکا مارے دے رہی ہے۔ انجکشن لگوا لگوا کر چھید کر دیئے۔ روز نئے نئے تعویز آتے تھے اور ساتھ میں مولوی صاحب

www.taemeernews.com

جھاڑ پھونک کے واسطے لائے جاتے تھے۔ جب کسی طرح نہیں مانیں تو میں بیمار بچے کو اٹھا کر ہوسپٹل لے گئی کہ کچھ تو آرام ملے۔ وہ تو کہو ہماری ڈاکٹرنی میری دوست ہے۔ ورنہ کون کسی کی بات سنتا ہے۔ یہ وہاں بھی جا کر چار باتیں ڈاکٹروں، نرسوں کو اور دس مجھ کو سنا آتی ہیں۔

بچوں کو وقت پر دودھ دینے کی ہماری ساس ایسی دشمن ہیں کہ کیا بتاؤں۔ وہ کہتی ہیں کہ ماں ہو کر بچوں کی دشمن ہوں۔ بچے بھڑکتے ہیں اور میں بیٹھی دیکھتی رہتی ہوں اور میرا دل پتھر کا ہے۔ میں بچوں کو پیدا ہوتے ہی کسی پھل کا عرق یعنی نارنگی یا سیب کا دیتی ہوں۔ جب پہلے بچے کو میں نے دیا تو کھڑی اور بیٹھی پیٹتی تھیں کہ میں ہرگز نہیں دینے دوں گی۔ یہ تو بچے کو نمونیا کر کے مارنا چاہتی ہے۔ ہمارے سسر بیچارے بڑے نیک ہیں۔ انھوں نے سمجھایا جب یہ کسی طرح نہیں مانیں تو مجھے میرے میکے چھوڑ آئے۔ چھ مہینے وہاں رہی پھر یہ جا کر لے آئے۔ مہینوں بات نہیں کی۔ رات کو کہتی تھیں کہ بچے کو اپنے پاس سلاؤ۔ میں الگ سلاتی ہوں تو ظلم کرتی ہوں۔ میرے تو تین بچے ہیں۔ سب پہلے دن سے الگ سوتے ہیں کہ کوئی بھوت پلیت چمٹ جائے گا۔ بچے کو اٹھا کر اپنے پاس سلاتی تھیں۔ اور نو اور رات کو دیکھو تو دودھ کٹوری سے بتی ڈال کر پلا رہی ہیں۔ جو میں منع کروں تو اکھٹوا اور دن کی کٹھن جاتی ہے۔ ہر بچے پر اسی طرح دق کرتی ہیں۔

مجھ کو گندہ، پھوہڑ نہ معلوم کیا کیا کہتی ہیں۔ ذرا ان کی طرف جا کر دیکھو۔ ہر طرف پیک پڑی ہوئی مکھیاں بھنکتی ہوئی۔ ان کا کام صفائی ہے۔ اگالدان پاس رکھا ہے لیکن صحن میں جب تھوکیں گی تو زمین پر۔ پاس بیٹھے ہوئے گھن آتی ہے۔ لیکن میں جو ہر چیز جگہ پر رکھتی ہوں بیلمن کیوں

125
www.taemeernews.com

کی وجہ سے ڈالتی ہوں تو گندی ہوں۔

اب سال بھر سے یہ خفگی کہ چولھا الگ کر لیا۔ اب کوئی کسی وقت بھی دونوں باورچی خانے جا کر دیکھ لے۔ میرے ہاں کبھی نہ ترکاری پھیلی ملے گی نہ برتن۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرے ہاں ایک بھی مکھی نہ ملے گی۔ ان کے ہاں ہر وقت مکھیوں کی بارات لگی ہے۔ کہتی ہیں کہ میں ہر جگہ گھر میں فنائل ڈال ڈال کر نحوست پھلاتی ہوں۔ ان کے خیال میں تو سلیقہ کے یہ معنی ہیں کہ نوکروں کو خوب تنگ کرو۔ پیٹ بھر کر کھانے کو نہ دو۔ ہر ایک روٹی اور چاول اور دال کو بیٹھے بیٹھے گنا کرو۔ نوکر بھی تو آدمی ہوتے ہیں۔ دو روز میں گھبرا کر بھاگ جاتے ہیں۔ میں نوکروں کے کپڑے بناتی ہوں زبردستی نہلوا کر بدلواتی ہوں تو کہتی ہیں کہ میاں کے روپے کا درد نہیں۔ نوکروں کو بادشاہ بنا رکھا ہے اور ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان کے نوکر میرے نوکروں کو دیکھ کر خراب ہوئے جاتے ہیں۔ میں گھر کے سب آدمیوں کو بگاڑ دیتی ہوں اور تو اور گھر میں کوئی آ جائے تو خفا ہوتی ہیں کہ سامنے کیوں ہوتی ہو۔ پردہ کیوں نہیں کرتیں۔ اب ان کے کئی دوست ہیں۔ جن سے بے تکلفی ہے بھابی کہا کرتے ہوئے آ جاتے ہیں۔ ایک آدھ دفعہ ایسا بھی ہوا کہ یہ گھر پر نہ ہوئے۔ بس قیامت اٹھا لی کہ میم بن گئی ہے۔ مردوں سے ملتی ہے۔ بے شرم ہے نہ معلوم کیا کیا کہا۔ جو میں نے کہا کہ آپ کی لڑکی بھی تو بے پردہ نکلتی ہے۔ اس کا میاں تو زبردستی نکالتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وہ تو اتنی بیک ہیں کہ ان کا نکلنے کو دل نہیں چاہتا اور میاں کے ظلم سے باہر نکلتی ہیں۔ میں اتنی خراب ہوں کہ میاں کی مرضی کے خلاف نکلتی ہوں۔ ہر ایک کے سامنے یہی کہتی ہیں کہ اپنی شرم کو غصہ کا گھونٹ پی کر چپ ہو جاتا ہے۔ ہماری نند تو کسی

www.taemeernews.com

مدرسہ میں بھی نہیں پڑھیں۔ شادی کے بعد میاں نے پڑھوایا۔ لکھوایا۔ ہر جگہ آتی جاتی ہیں اور ہماری ساس کو بھی اچھی طرح معلوم ہے۔ لیکن چھپا جاتی ہیں۔ پچھلی دفعہ جب میں تو میں نے اماں کے سامنے ہی پوچھا کہ سچ بتاؤ کیا زبردستی کی جاتی ہے۔ جب باہر نکلتی ہو یا اپنی مرضی سے۔ وہ بولیں کیوں کیا بات ہے۔ میں تو اپنی مرضی سے نکلتی ہوں اب مجھے کوئی پردے میں رکھنا بھی چاہے تو نہ رہوں۔ تو ہماری ساس سن کر کیا کہتی ہیں کہ میرے لڑکے کو تو مجھ سے چھڑا لیا ہے۔ اس کے دل میں میری نفرت بٹھا دی اب میرے دوسرے بچوں پر بھی ہاتھ صاف کر رہی ہے میرے بچے کے سامنے میری برائی کیا کرو۔ الٹ بھی ان کا پلٹ بھی ان کا وہی کام میں کروں تو برا ہو جاتا ہے۔ اور ان کی لڑکی کریں تو اچھا ہو جاتا ہے۔

ان کو کبھی میرے سے ہنس کر بات کرتے تو دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ انھیں سب سے زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ یہ مجھ سے کیوں محبت کرتے ہیں۔ میں کمرے میں آئی اور جو یہ مجھ سے خوش ہو کر بول لئے تو غضب ہو جاتا ہے۔ اور تو اور ہر وقت میری صورت کی برائی ان کے سامنے ہوتی ہے۔ ان کو کبھی شرارت سوجھتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ اماں اور تو سب عیب ہیں لیکن شکل تو بہت اچھی ہے۔ کہنے لگتی ہیں شرم نہیں آتی جورو کی تعریف میرے سامنے کرتا ہے۔ پھر تو وہ میری تعریف کرتی ہیں۔ ان کو تو ہنسی آتی رہتی ہے۔ میرا دل جل جاتا ہے۔ میں تو چپکی اٹھ کر چلی آتی ہوں۔ ہر وقت میرا اپنا مقابلہ بیٹے کے سامنے کرتی رہتی ہیں۔ بھلا کہاں ماں کہاں بیوی۔ ان کا تو اس دن کلیجہ ٹھنڈا ہو جس دن یہ مجھے یا تو ماریں یا گھر سے نکال دیں۔ یا دوسری شادی کر لیں۔ اور کبھی جو میری دیورانیاں، جٹھانیاں ہیں وہ الگ الگ شہروں میں ہیں۔ جب وہ آجاتی ہیں تو تھوڑے دن تو ان کی خاطر ہوتی ہے پھر ان میں

127
www.taemeernews.com

بھی عیب نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور پھر یہ ہوتا ہے کہ میں نے سب کو بلا کر ان کے خلاف "مس کوٹ" بنائی ہے۔ بری تو سب ہی بہوئیں ہیں لیکن سب سے بری میں ہوں اور بدقسمتی سے تھوڑی پڑھی لکھی ہوں۔ تو میم صاحب کا خطاب مل گیا ہے۔ میں تو جب یہ اپنی بڑبڑاہٹ شروع کرتی ہیں تو میں ادھر جا کر کواڑ بند کر کے کچھ کام کرنے لگتی ہوں کہ نہ سنوں گی نہ برا لگے گا۔ اب صبح سے اس بات پر بڑبڑا رہی ہیں کہ بچوں کے میں نے کل ٹائیفائڈ کے ٹیکے لگوا دیئے۔ ان کو تھوڑا تھوڑا بخار ہے۔ بڑا لڑکا بہت لاڈلا ہے اور جا کر پاس لیٹ گیا۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر جو باتیں سنانی شروع کی ہیں اب دو گھنٹے تو ہو گئے ابھی دیکھو کب تک یہ سلسلہ چلتا ہے۔

www.taemeernews.com

چور

رات کے دس بجے کا وقت تھا۔ میں اپنی کلینک میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اور ایک میڈیکل جنرل کا مطالعہ کر رہی تھی۔ کہ دروازہ کھلا اور ایک آدمی ایک بچہ لے کر داخل ہوا۔ مجھ کو اپنی نرس پر غصہ آیا کہ یہ دروازہ کھلا چھوڑ گئی۔ میرے مریض دیکھنے کا وقت مدت ہوئی ختم ہو چکا تھا۔ میں نے رکھائی سے کہا "میرے مریض دیکھنے کا وقت مدت ہوئی ختم ہو چکا۔ یا تو کل صبح لانا۔ ورنہ کسی دوسرے ڈاکٹر کو دکھا دو۔"

مرد چھوٹے قد کا تو تھا لیکن بدن کسرتی تھا اور بچہ جو گود میں تھا۔ اس کا سانس بری طور سے چل رہا تھا اور صاف ظاہر تھا کہ نمونیہ ہو گیا ہے۔ بچہ گردن ڈالے نڈھال تھا اور چل چلاؤ کے قریب معلوم ہوتا تھا۔ مرد نے اکڑ کر کہا۔ "میم صاحب فیس لے لیجئے اور کیا آپ کو چاہیے۔" میں فیس کے نام سے شاید دھیمی بھی ہو جاتی پر اس کی اکڑ سے چڑ کر بولی "فیس کے بغیر کوئی ڈاکٹر

129
www.taemeernews.com

دیکھتا ہے۔ میں اس وقت مریض نہیں دیکھتی۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ وقت ڈاکٹروں کے آرام کا ہوتا ہے۔ دوسرے تمھارا بچہ بہت بیمار ہے۔۔۔۔۔"

"جبھی تو آپ کے پاس لایا ہوں۔ ہماری سالی کا بچہ تو اور بھی بیمار تھا آپ کے علاج سے اچھا ہو گیا تھا"۔ اب اس کا لہجہ انکسارانہ نہ تھا۔

"میں نے بگڑ کر کہا: "جو میرا ہی علاج کرانا تھا تو جلدی آتے"۔

"کوئی دوسرا لانے والا ہی نہ تھا اور میں اس سے پہلے نہیں آ سکتا تھا"۔

اس کی کنپٹی پر زخم کا ایک گہرا نشان تھا۔ اتنا بدمزاج آدمی ضرور کسی بار میٹ میں زخمی ہوا ہوگا۔

بچے نے بالکل مردہ آواز میں رونا شروع کیا۔ جس کو دیکھ کر مجھ کو ترس آگیا اور میں آلہ کو نکال کر کھڑی ہوئی۔ مرد نے فوراً قمیض کی جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ بچے کو دیکھ کر میں نے کہا کہ "ایک انجکشن تو میں فوراً لگائے دیتی ہوں۔ چار روز تک برابر یہ انجکشن چار چار گھنٹے پہ لگیں گے انتظام کر لینا"۔ اس کی غربت کی طرف نگاہ کر کے میں نے کہا۔ "فیس کی ضرورت نہیں۔ انجکشن کی قیمت میں لے لوں گی۔ باقی کی دوائیں تم بازار سے منوا لو"۔

اس نے بھرا کر کہا۔ "صاحب میں خیرات کا علاج نہیں کرتا"۔ اس نے اپنے کرتے کے اندر ہاتھ ڈالا اور ایک رنگ چھپا نکالا۔ اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا اور ساتھ ہی نگاہ اس مرد پر پڑی۔ وہ گرہ کھول رہا تھا۔ اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے ایک موٹی سی گڈی نوٹوں کی نکالی کم از کم پانچ سو کے نوٹ ہوں گے۔ اور دس روپیہ میز پر رکھ کر بولا۔ "بس یا اور چاہیئے"۔

www.taemeernews.com

میں نے ٹیلیفون کا جواب دیا "ہاں۔ ہاں۔ ہاں"۔ اس کی طرف مخاطب ہوئی اور پوچھا۔ "تمھارا نام کیا ہے"

"کمن" یہ کہہ کر ذرا جھجکا۔

"کمن" یہ نام تو کہیں میں نے سنا تھا۔ ہاں یاد آیا۔ داروغہ جب میرے ہاں چوری کی تحقیقات کرنے آیا تھا۔ تب اس نے کمن کا نام لیا تھا اور پولیس والے آپس میں بات کرتے میں کمن کی کنپٹی کے نشان کی بات بھی کر رہے تھے۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ لاپرواہی سے ایک طرف کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے انجکشن تیار کرنا شروع کیا اور پوچھا۔ "تمھارا پیشہ کیا ہے؟"

وہ جواب دینے والا ہی تھا کہ میں نے جواب دیا۔ "تانگہ چلاتے تھے نا؟"

"آپ کو کیسے معلوم؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ "آپ نے مجھے کہاں دیکھا؟ میں نے تو پہلے کبھی آپ کے ہاں نہیں آیا۔"

میں سرنج میں دوا بھر کر بولی "کمن تم بھولتے ہو۔ ابھی دو مہینے ہوئے ایک رات کے درمیان تم آئے تھے۔ اور میرا سارا گھر صاف کر کے چل دیئے۔ تم چوری کیوں کرتے ہو۔۔۔۔۔؟"

اس نے آنکھ میں آنکھ ڈال کر برابری سے جواب دیا۔ "میم صاحب اپنا اپنا پیشہ ہے"۔ اب میری باری حیران ہونے کی تھی۔

"پر یہ تو بتایئے کہ میرا نام کس نے آپ کو بتایا؟"

"داروغہ جو تحقیقات کرنے آئے تھے وہ لوگ آپس میں تمھارے کارناموں کی باتیں کر رہے تھے۔ میں نے بھی سن لیا اور تمھارے ہاں تلاشی بھی تو ہوئی تھی"۔

وہ مغلظات گالیاں پولیس والوں کو دینے لگا۔

"یہ سارے پولیس والے مادر۔۔۔۔۔۔ پہلے اپنا حصہ وصول لیتے ہیں

www.taemeernews.com

پھر کہیں ہمارا حصہ ہم کو ملتا ہے۔ ہن..... ہم کو یہ بدنام کرتے ہیں۔ چور نے کہیں چوری کر اور شاہ سے کہیں ترا گھر لٹتا ہے..... بیٹی..... داروغہ کو میں سمجھ لوں گا..... میرے گھر میم صاحب سال میں سینکڑوں بار دوڑ آتی ہے۔ پر یہی پولیس والے مجھے پہلے سے خبر کر دیتے ہیں سب سالوں کے مہینے نہیں باندھ رکھے ہیں میں نے؟ پانچ سال سے برابر وارنٹ میرے نام جاری رہتا ہے۔ پر خدا کا فضل ہے کہ ابھی تک تو پکڑا نہیں گیا۔" اس نے شیخی کے انداز میں مجھے اپنا حال بتایا۔

میں نے انجکشن لگانے کو بچے کی ٹانگ پکڑ لی۔ پر وہ بڑبڑاتا ہی رہا۔
"خود سالے آ کر بتا جاتے ہیں کہ تلاشی لینے آ رہے ہیں، میم صاحب۔ پولیس اگر ہمارا ساتھ نہ دے تو ہم دو دن کسی علاقہ میں ٹک نہیں سکتے..... اور پھر ہمیں کو بدنام کرتے ہیں۔"

"دیکھو بچے کی ٹانگ مت ہلنے دو۔"

"سالے آدھے سے زیادہ تو خود کھا جاتے ہیں۔ ہم کو بچتا ہی کیا ہے۔ ساری محنت ہم کریں۔ پکڑے جائیں تو ہم۔ جیل کی چکی پیسیں تو ہم۔ یہ مادر..... تو گھر بیٹھے مفت کا مال اڑاتے ہیں۔" اس کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا اور بچے کے رونے کی بھی جو دھیمے دھیمے سسک رہا تھا۔ اس نے پرواہ نہ کی۔ میں نے بچے کو میز پر لٹا کر تھپکنا شروع کیا۔ اب اس میں اور مجھ میں بے تکلفی ہوتی جا رہی تھی۔ اور میں اس سے باتیں کرنا چاہتی تھی میں پہلی بار ایک چور سے اور وہ بھی ایسا چور جو میرا اپنا گھر صاف کر چکا تھا ملی تھی۔ میں نے کہا "لیکن تم چوری کرتے ہو۔ تم کو ترس نہیں آتا۔ میرا گھر تو تم نے بالکل صاف کر دیا۔ پہننے تک کو کپڑا نہیں رہا۔ عینکوں کا تم کو کیا مل جاتا ہوگا۔ بھلا بتاؤ میری عینک بھی تم لے گئے؟"

www.taemeernews.com

"کوئی چیز بیکار نہیں جاتی۔"

میں نے اس کی طرف حیرت سے دیکھ کر کہا اور میری مری ہوئی ماں کی نشانی ایک ڈوپٹہ رکھا وہ بھی تم لے گئے؟"

اس کو پکڑوا دوں؟ میرے دل میں آیا۔

"کون سا؟"

"سفید جالی کا کڑھا ہوا تھا۔ تم کو کیا یاد ہوگا۔ نہ معلوم جب سے اب تک کتنی چوریاں کر چکے ہو گے۔ تم کو اب کیا یاد ہوگا۔"

میں اس کو باتوں میں لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ "تم نے چوری، کیسے شروع کی؟" کیا میں بجلی کا بٹن دبا کر نوکروں کو بلا لوں۔

"جیسے سب کرتے ہیں۔ اپنے استاد سے سیکھی!"

"استاد سے؟ تمھارے ہاں بھی استاد ہوتے ہیں؟"

"اور کیا۔ آپ نے ڈاکٹری کیسے سیکھی؟"

"میں نے تو کالج میں پڑھا تھا۔" گھنٹی بجاؤں یا نہیں۔

"ہمارا بھی تو کالج ہوتا ہے....." وہ مسکرایا۔ "میرا کالج تو جیل خانہ تھا۔ ایک مار پیٹ میں چھ مہینے کی جیل ہو گئی تھی۔ وہیں استاد سے ملاقات ہوئی...."

بچہ اب پھر رونے لگا اور اسی وقت دروازہ کھلا اور میرا چھوٹا بھائی اپنی فوجی وردی میں داخل ہوا۔ جوان لڑکا تھا۔ کمن سے کہیں زیادہ طاقتور تھا۔ اس کے پاس ریوالور بھی لٹک رہا تھا۔ کمن اس کو دیکھ کر چونکا اور پھر جلدی سے نسخہ اٹھا کر چلنے لگا۔ پکڑوا دوں یا نہ پکڑوا دوں۔ پکڑوا دوں یا نہ پکڑوا دوں؟ میں نے جلدی جلدی سوچا۔ میں ابھی فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ وہ باہر چلا گیا۔

133
www.taemeernews.com

"آپا۔ کیا بات ہے۔ پریشان کیوں ہو"۔؟
"تمھیں معلوم ہے یہ کون تھا؟" یہ وہ شخص تھا جس نے میرے ہاں چوری کی تھی"۔

"تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"
"میری اس سے باتیں ہوئیں"۔
"باتیں ہوئیں اور تم نے اس کو جانے دیا!" یہ کہہ کر میرا بھائی دروازے کی طرف لپکا اور باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ سڑک صاف پڑی تھی۔ وہ چند ایک طرف کو بھاگا اور سڑک کے موڑ پر جا کر بھی دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہ تھا۔

اندر آ کر غصہ سے کہنے لگا۔ "آپا تم بھی کمال کرتی ہو؟ چور تم کو ملا اور تم نے چھوڑ دیا۔ یہ گورکھا کس واسطے نوکر رکھا ہے؟ اس کو کیوں نہ بلایا۔ اور جب میں آ گیا تھا جب بھی خاموش رہیں۔ ریوالور پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ میں اس حرامزادے کو کبھی نہ جانے دیتا۔ میرا بھائی ایک مشہور شکاری بھی ہے۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہی کھیا ہٹ تھی جو شکار ہاتھ سے نکل جانے پر ہوا کرتی ہے۔

"بھلا کہیں دنیا میں سنا ہے کہ آدمی چور کو یوں نکل جانے دے"۔
میں خاموش تھی۔

"آپ بہت جذباتی ہیں۔ بچے کو دیکھ کر پگھل گئی ہوں گی۔ لو ذرا سنو اسکی ہمت کا تو اندازہ ہو کہ بیس روپیہ یہاں چھوڑ گیا۔ یہ بھی چوری کے ہوں گے"۔

"اس کے پاس تو ۵ سو چھ سو کے نوٹ تھے۔

134
www.taemeernews.com

"واللہ آپ بڑی ہیں تو ہوا کریں۔ لیکن ہیں بہت بے وقوف!"

یہ بات اب میرے ملنے والوں کو معلوم ہو چکی ہے کہ جس نے میرے ہاں چوری کی تھی وہ اپنے بچے کا علاج کروانے آیا تھا۔ اور میں اس کو پکڑوا سکتی تھی۔ لیکن جانے دیا۔ سب میرا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن کوئی میری دماغی کشمکش کو نہ سمجھا تھا۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے غلطی کی تھی یا نہیں۔

میرے ایک دوست پولیس کے افسر ہیں۔ جب انھوں نے سنا تو کہا کہ "معلوم ہے آپ کو آپ نے قانوناً بھی غلطی کی ہے۔ جس آدمی کے نام پر وارنٹ ہو اس کو نہ پکڑوانا جرم ہے"۔

میں سوچتی ہوں اور ان چوروں کا کیا ہوگا جن کے نام پر نہ وارنٹ ہیں اور نہ کبھی ہوں گے۔ چوری کی بھی تو کئی قسمیں ہیں۔ اٹھائی گیری۔ جیب کتری۔ نقب زنی۔ ڈاکہ مارنا۔ چور بازاری۔ دوسروں کی محنت کی فصل کو لے کر اپنا گھر بھر لینا۔ اور غیر ملکوں کو ہضم کر جانا۔ یہ سب چوری میں داخل نہیں ہیں؟

لوگوں کے کہنے سننے کی تو مجھ کو پرواہ نہ تھی۔ لیکن دراصل جب ہر طرف مجھ کو بے وقوف سمجھ کر میرا مذاق اڑنے لگے تو میرے ضمیر کے اندر ایک کرید پیدا ہو گئی۔ کیا سچ مچ اس چور کو نہ پکڑوا کر میں نے کوئی اخلاقی گناہ کیا تھا؟"

میں اپنے شہر کی ایک باشندہ ہوں۔ کچھ شہری ذمہ داریاں مجھ پر عائد ہیں کیا اس چور کو نہ پکڑوا کر میں نے کوئی شہری جرم کیا ہے۔

پھر میری نظر چاروں طرف دوڑنے لگی میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے چور

135
www.taemeernews.com

یگلا بھگت بنے گھومتے ہیں۔ بڑے بڑے محلوں میں رہتے ہیں۔ ہوائی جہازوں میں اڑتے ہیں اور بڑے بڑے پر اعظم کھائے بیٹھے ہیں یا کھانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اور اپنی حفاظت کے لئے جیسے کمن پولیس کو تو صرف رشوت ہی دیتا تھا۔ یہ اس سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے۔ سارے ملک کی پولیس و فوج ان کی تنخواہ دار تھی۔ کمن ۵۰۰ ۔۔۔ چوری کے نوٹوں پر سر اکڑا کر اور برابر کا ہو کر بات کرتا تھا۔ یہ صرف اکڑتے ہی نہیں بلکہ اوپر سے بیٹھ کر حکم بھی دیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

اندھے کی لاٹھی

نواب محمد اصغر علی خاں اور نواب محمد اقبال علی خاں دونوں سگے بھائی تھے اور نواب محمد مکرم علی رئیس کے لڑکے تھے۔ نواب صاحب نے گو بہت زیادہ روپیہ اپنی زندگی میں اڑا دیا تھا لیکن جب ان کا انتقال ہوا تو لڑکے نابالغ تھے جائداد کورٹ آف وارڈ کر دی گئی اور یہی وجہ تھی کہ بچ گئی۔ دوسری جائداد ملی۔ ان کی ایک پھوپھی جو لاولد تھیں اپنی ریاست بھی چھوٹے بھتیجے کو دے گئیں تھیں۔ دونوں بھائیوں میں وہ محبت اور دوستی تھی کہ چھوٹے کی اس حرکت سے دونوں میں ذرا میل نہ آیا۔ گو اصغر کی دلہن جل بھن کر رہ گئیں۔ میاں کو ہزار بھڑکایا کہ اقبال پر مقدمہ چلا کر اپنا شرعی حق حاصل کریں لیکن انھوں نے سنی ان سنی کر دی اور بھائی پر کبھی ظاہر تک نہ ہونے دیا کہ ان کو برا لگے۔ دوسرے اقبال لاولد تھے اور جائداد بھاگ کہاں جاتی۔

www.taemeernews.com

جب تک ساس زندہ رہیں دونوں بہوئیں ایک ہی گھر میں جیسے تیسے رہیں۔ ان کے مرنے کے بعد اصغر اور اقبال نے بہت کوشش کی کہ دو گھر نہ ہوں۔ لیکن آخر میں بیویوں کی ہر وقت کی تو تو میں میں سے تنگ آکر چھوٹی حویلی میں اٹھ گئے۔ گو چولھے دو ہو گئے تھے۔ اور ان کی بیویاں ایک دوسرے کے خون کی پیاسی تھیں۔ لیکن ان دونوں بھائیوں کی محبت ایک ایسی مضبوط بنیاد پر کھڑی تھی کہ اس کا گرانا بہت مشکل تھا۔

اپنے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اقبال بھائی کی اولاد پر دل وارتے تھے۔ ہزار دفعہ بیوی سے خوشامد کی کہ وہ بھائی کا ایک لڑکا گود لینا چاہتے ہیں لیکن انھوں نے جٹھانی کی اولاد کو پالنے سے انکار کر دیا۔

اصغر دلہن کے تو اللہ رکھے نو بچے تھے اور بچاری اقبال دلہن بانجھ مشہور تھیں۔ اولاد نہ ہونے کا غم ان کو کھائے جاتا تھا۔ اولاد نہ ہو تو نہ سہی لیکن جٹھانی کے طعنے اور مذاق زندگی وبال کئے ہوئے تھے۔ یہ خیال تو ان کو بیمار ہی کر دیتا تھا کہ میاں کی جائداد بھی اصغر دلہن کی اولاد میں چلی جائے گی۔ وہ چھپ چھپ کر علاج کراتیں دعائیں مانگتیں۔ تعویذ گنڈا غرضیکہ سب کچھ کرتیں۔ آس پاس کیا دور دور کے مزاروں پر جاتیں۔ منتیں مانتیں کہ کسی طرح اللہ ان کو ایک لڑکا دے دے۔ وہ ہزار پوشیدہ طور پر علاج کرتیں لیکن پھر بھی اصغر دلہن کو خبر ہو ہی جاتی تھی۔ اور ان کے ہاتھ دیورانی کو جلانے کا ایک نیا شگوفہ لگ جاتا۔

"ارے دولت لٹا رہی ہیں دولت! موئے میکے والے ہر وقت کھڑے رہتے ہیں وہ الگ، ملا، سیانے لگے رہتے ہیں وہ الگ۔ کہیں پتھر میں سے خون نکلا ہے جو اب ان کے بڑھاپے میں اولاد ہو گی؟ اصغر دلہن بھرنا

www.taemeernews.com

محفل میں اتنی زور سے کہتیں کہ اقبال دلہن سن لیں اقبال دلہن جس کا میکہ نسبتاً غریب تھا اور جو اولاد کی خاطر ہر وقت روپیہ صرف کرتی رہتی تھیں اس قسم کے طعنے سن کر آگ ہو جاتیں اور ذرا سی دیر میں دونوں میں نہ مزید ار گفتگو شروع ہو جاتی کہ محفل کی رونق بڑھ جاتی۔ اصغر دلہن ہنس ہنس کر چٹکیاں لیتیں اور اقبال دلہن جھنجھلا کر جواب دیتیں۔ آخر میں بے بس ہو کر رونے لگتیں۔ منہ پیٹ لیتیں اور کوسنے کاٹنے پر اتر آتیں۔ ایسی ملاقاتیں زیادہ تر دوسروں کے گھر پر ہی ہوتی تھیں۔ اسی وجہ سے اقبال دلہن نے ہر جگہ کا آنا جانا کھٹھائی کی وجہ سے چھوڑ ہی دیا تھا۔ لیکن پھر بھی ایک شہر کا رہنا کہیں نہ کہیں ملاقات ہو ہی جاتی تھی۔

بیس برس کے بعد اقبال دلہن کی قسمت پھری اور کچھ امید ہوئی۔ پہلے تو انھوں نے ڈر کی وجہ سے کسی سے ذکر نہیں کیا کئی دفعہ اسی قسم کے شبہات ان کو پہلے بھی ہو چکے تھے اور ہر دفعہ کھٹھائی کے ہاتھ میں ایک نیا شگوفہ مذاق اڑانے کا مل چکا تھا جب ظاہر ہونے لگا تو اصغر دلہن گھبرائیں کہ کہیں سچ مچ ہی ان کے لڑکا نہ ہو جائے ایک تو جائداد کا مالک پیدا ہو جائے گا۔ اور دوسرے پھر دیورانی برابر کی ہی ہو جائے گی۔ بہت گنڈے تعویذ ٹوٹکے غرضیکہ کسی قسم کا جادو باقی نہ چھوڑا کہ بچہ ضائع ہو جائے لیکن ایسا لگتا تھا کہ اقبال دلہن کے مولوی زیادہ زور دار تھے اور ہر بلا کی روک تھام کیے رہتے تھے کہ نو ماہ بعد اللہ نے بجائے ایک لڑکے کے دو بیٹیاں دیں۔ اقبال کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا ادھر بیٹھک میں لوگ مبارک سلامت کو آنے لگے اور دوسری طرف ڈیوڑھی پر نوبت بجنی شروع ہوئی۔ اقبال دلہن کا اصرار تھا کہ نوبت بہت شان کی ہو تاکہ اصغر دلہن سنیں اور جلیں۔ اصغر دلہن کب چوکنے والی تھیں فوراً میاں سے کہہ کر اپنے دو چھوٹے لڑکوں کا پیغام دلوا دیا۔ اقبال

www.taemeernews.com

جو بھائی پر جان دیتے تھے۔ یہ سن کر پھولے نہ سمائے اور بھائی کو زبان دے دی۔ جب زنانہ میں آکر ذکر کیا تو اقبال دلہن اپنی رہ گئی پھول تن کر پلنگ پر بیٹھ گئیں اور میاں کو ہزار دل سنائیں اب وہ کیوں دبتی۔ اب انھیں کون بانجھ کہہ سکتا تھا۔ انھوں نے ان منگنوں کو ماننے سے صاف انکار کردیا اقبال گو فطرتاً کمزور آدمی تھے۔ بیوی کا ہمیشہ خیال رکھا لیکن اس بات پر وہ بھی اڑ گئے۔ "یہ لڑکیاں تو بھائی صاحب کی ہیں۔ میں دس آدمیوں کے سامنے زبان دے چکا ہوں۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

اصغر دلہن نے مٹھائی بھیجی باوجود بیوی کی مخالفت کے اقبال نے رکھ لی۔ مٹھائی گھر میں رکھ تو لی لیکن وہ سڑ سڑ کر پھنکی اقبال دلہن نے ہاتھ نہ لگایا جب کوئی انہیں مبارک باد دیتا تو ناک بھوں سکیڑ کر کہتیں دیکھا جائے گا۔ نہ میں نے منگنیاں کیں اور نہ میں جانوں۔ لڑکیاں جب ذرا بڑی ہوئیں تو اصغر دلہن کی خواہش ہوئی کہ نکاح بھی ہو جائیں۔ اقبال دلہن کہتیں کہ میری زندگی میں تو ہوگا نہیں۔ اقبال کی اتنی ہمت نہ تھی کہ نکاح بیوی کی بغیر شرکت کر دیتے۔ غرضیکہ اسی کشمکش مباحثہ میں احمدی بیگم وفاداری بیگم پندرہ برس کی ہوگئیں۔

ویسے تو جڑواں بچے ایک دوسرے سے زیادہ تر مشابہ ہوتے ہیں لیکن احمدی اور وفاداری ہمیشہ ایک سے کپڑے ایک سی صورت قد و قامت کے ساتھ بالکل ایک دوسرے کی تصویر تھیں۔ ماں تک دھوکا کھا جاتی تھیں۔ گو احمدی صرف گھنٹہ بھر بڑی تھی لیکن اپنی بزرگی پر انھیں بہت ناز تھا۔ اور وفاداری سے اپنے کو بڑی آپا کہلواتی تھیں۔ ماں کی تربیت کا اثر تھا کہ دونوں بہنیں حجی کو قصائی سے کم نہ سمجھتی تھیں اور جب اپنی آئندہ زندگی کا خیال کرتیں تو کانپ

140
www.taemeernews.com

جاتیں لیکن اتنی ہمت کہاں سے لاتیں کہ باپ سے کہہ دیتیں کہ ہم چچا کے لڑکوں سے شادی کرنا نہیں چاہتیں۔ کنواری لڑکیاں ہندوستانی طریقہ سے پلی ہوئی تھیں۔ اس قسم کے لفظ زبان پر لا ہی کب سکتی تھیں۔ جب ماں باپ کی روز روز کی لڑائی اپنے متعلق سنتیں تو چھپ چھپ کر رو لیتی تھیں۔ پندرہ سال کی ہوگئیں تھیں اور اقبال دلہن کسی طرح راضی ہی نہیں ہوتی تھیں "عمر بھر کنوارا رکھوں گی۔ تمہارے بھائی کے گھر نہ دوں گی"۔ زہر کھلا کے سلا دوں گی۔ اصغر الدین کے بیٹوں کو نہ بیاہوں گی"۔ گو کنوارا رکھنے اور زہر کھلانے کی دھمکی میاں کو روز دیتی تھیں لیکن بیٹیوں کا جہیز برابر تیار کر رہی تھیں۔

اصغر دلہن کو بھی ضد تھی کہ آخر ایک دادا کی جائداد ہے۔ الگ کیوں ہو دیورانی کا جب دل چاہے کریں مجھے جلدی نہیں ہے۔ اصغر غریب بالکل بڈھے ہو چکے تھے اور بھاوج کی بدمزاجی اور نہیں نہیں سے تنگ آ گئے تھے۔ لیکن جائداد کا لالچ برا ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنی بات پر اڑے تھے۔ اور برابر بھائی پر زور ڈال رہے تھے کہ شادی کر دو۔ جب لڑکیاں چچا کے گھر مانگی ہوں تو کس کی مجال ہے کہ پیغام بھیجے جو کبھی کسی نے ذکر کیا بھی تو اصغر دلہن سے پنڈ چھڑانا مشکل ہو گیا۔

احمدی اور قادری کی آئندہ زندگی کا مسئلہ یوں کھٹائی میں پڑا ہوا تھا کہ ان کی قسمت جاگی اور اقبال چھ روز نمونیہ میں مبتلا رہ کر فوت ہو گئے۔ بیماری کے زمانہ میں اصغر اور ان کی بیوی نے ہزار کوشش کی کہ نکاح ہو جائیں لیکن اقبال دلہن نے میاں کی ایسی چوکیداری کی کہ اصغر دلہن کی ایک نہ چلی اور لڑکیوں کو بن بیاہا چھوڑ کر اقبال دنیا سے سدھار گئے۔ ان کی موت کے بعد حال کھلا کہ وہ زندگی میں سب جائداد بیوی کے نام کر گئے تھے۔ اصغر دلہن

تلملا کر رہ گئیں ۔" ہائے اب کیا کروں اب تو یہ سونے کی چڑیاں ہاتھ سے گئیں ۔

میاں کے مرتے ہی اقبال دلہن نے بچپن کی منگیاں توڑ دیں ۔ یہ خاندانی نسل کے تھے ۔ اصغر اور ان کا خاندان اس بات پر اڑ گئے کہ بچپن کی مانگیں ٹوٹ نہیں سکتیں ۔ نکاح ٹوٹ جائیں منگنیاں نہیں ٹوٹ سکتیں ۔ ورنہ خون ہو جائیں گے ۔ شادی ہو گی تو یہیں ہو گی ۔ مجال ہے کسی کی کہ ان لڑکیوں کو بیاہ کر لے جائے ۔

اقبال دلہن چپکے چپکے ان کی بات لگاتیں لیکن چچا اس کو کسی نہ کسی طرح توڑ کر دم لیتے ۔ کہیں لڑکیوں میں عیب بتاتے کہیں ماں کو دیوانہ کہتے ۔ اس طرح دو سال نکل گئے ۔ احمدی اور قادری کو بَر نہ مل سکے ۔

دہلی میں سید منظور حسن صاحب ایک نہایت عقیدت مند اور عالم فقہ اور شرع رہتے تھے ۔ ان کے علم اور نیکی کی اتنی دھوم تھی کہ لوگ ان کے ہاتھ پر بیعت کرتے تھے ۔ ان کے فتوے ایک بہت اونچا درجہ رکھتے تھے اور ان کے تعویذ تو ہزاروں میں نواب و رئیس خرید کر مرادیں پاتے تھے ۔ علم ہی کی برکت تھی کہ مولوی صاحب غریبی کے گڑھے سے نکل کر امیری کی بلندی پر جا پہونچے تھے اور مسلمانوں کے سیاسی معاملات پر بھی ان کی آواز کافی زور اور قدر رکھتی تھی ۔ ان مولوی صاحب نے جب اقبال دلہن کا حال سنا تو اپنے لڑکوں کا پیغام بھیج دیا ۔ اقبال دلہن نے غیب سے مدد سمجھ کر فوراً منظور کر لیا ۔

چچا کو خبر ہوئی وہ دہلی مولوی صاحب کے پاس پہونچے اور اپنا حق ان لڑکیوں پر جتایا ۔ مولوی صاحب جو روپیہ کی قدر ایک رئیس کی بہ نسبت زیادہ

www.taemeernews.com

کرنے لگے۔ فرمانے لگے "نواب صاحب مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کے خاندان میں اس قدر نا چاقی ہے۔ اور اس حالت میں تو یہی بہتر ہوگا کہ ان کی شادیاں کہیں باہر ہوں اور اب میں تو اپنی زبان دے چکا ہوں واپس نہیں لے سکتا۔" نواب صاحب پہلی بار منھ کی کھا کر گھر واپس آئے۔ بیوی سے ذکر کیا۔ انھوں نے گھر میں ایک کہرام مچا دیا۔ نواب اصغر علی خاں کے لڑکے بھی اس کو اپنی ہتک عزت سمجھے اور مرنے مارنے کو تیار ہو گئے۔

شادی تو ایسی حالت میں کیا ہوتی۔ ہر وقت ڈر تھا کہ اصغر دلہن اور ان کے صاحبزادے کچھ نہ کچھ فساد برپا کر دیں گے۔ لہذا مولوی صاحب کی عقل نے سب کام سہولت سے ادا کر دیا۔ نکاح کی تاریخ چاند کی اکیس ٹھہری۔ بہت زور شور کی تیاریاں اقبال دلہن نے شروع کیں۔ رقعے بٹے۔ لوگ اس بیاہ کے اس طرح منتظر تھے جس طرح گاؤں میں لوگ رام لیلا کے رہتے تھے۔

نو تاریخ کو مولوی صاحب مع دولہاؤں قاضی اور گواہوں کے رات کے گیارہ بجے موٹر میں آئے۔ نکاح پڑھوا کر فوراً دونوں دلہنوں کو لے کر رخصت ہوئے اس کی خبر سوائے اقبال دلہن اور جگیمن بڑھیا کو جو اقبال دلہن کی انا تھی اور کسی کو کانوں کان نہ ہوئی۔ اب جگیمن بیچاری کو نہ سنائی۔ بٹھک سے دیتا تھا لیکن اقبال دلہن نے اس ڈر سے کہ خبر نہ ہو جائے اس کو دلہنوں کے ساتھ کیا۔ جب دوسرے دن اصغر دلہن کو خبر ہوئی تو سر پیٹ کر رہ گئیں۔

مولوی صاحب کی بیوی نے اپنی قریبی رشتہ داروں کو جمع کر لیا تھا۔ انھیں اس طرح خالی گھر میں دلہنیں اتروا تے ہوئے وہم آتا تھا۔ سب کی سب پریشان تھیں کہ اب نہ معلوم کیا ہوگا۔ جب خیریت سے ڈیڑھ بجے موٹریں آ کر رکیں اور معلوم ہوا کہ دلہنیں آگئیں تو سب کو اطمینان ہوا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ مہا دیٹی برس

www.taemeernews.com

کر کھل رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کچھ کچھ ابر اور کبھی کبھار کی بوندا باندی سردی کو چمکا رہی تھیں۔ بیویاں انگیٹھیاں لئے بیٹھی تھیں۔ اس سردی میں کوئی دلہنیں اتروانے اٹھیں اور کوئی نہ اٹھیں۔ سب کو سونے کی جلدی تھی۔ دلہنیں سیدھی اوپر بھیج دی گئیں۔

کنواری لڑکیاں ایک کمرے میں زمین پہ بستر کئے آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ایسے موقع ان بیچاریوں کو کم ملتے تھے کہ آپس میں بیٹھ کر باتیں کر سکیں۔ ایسے موقعوں پر تو وہ رات رات بھر شادی بیاہ۔ دولھا دلہن کی باتیں کر کے گذار دیتی تھیں۔

لڑکوں کی ماں کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا جو زیور اور کاغذات لڑکیوں کو ملے تھے ان کو دیکھ دیکھ کر وہ باغ باغ ہوئی جاتی تھیں۔ بیویاں رشک سے ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سب کو جمائیوں پہ جمائیاں آ رہی تھیں۔ "لوائیں تو چلی مارے نیند کے بیٹھا نہیں جاتا" کہہ کہہ کر کمر ٹھسکتی جاتی تھیں۔

دونوں دولھا اس قسم کی خفیہ شادی سے بہت خوش تھے۔ ہر ایک ان پر رشک کر رہا تھا۔ برابر والے تو چھیڑ چھیڑ کر ناک میں دم کئے دیتے تھے۔ بڑے صاحبزادے جن کو علم دین میں خاصی مہارت ہوتی جاتی تھی اپنی فتح مندی پر بہت نازاں تھے اور اپنے رقیبوں کا مذاق اڑا رہے تھے۔ چھوٹے صاحب جو شاعرانہ مزاج رکھتے تھے اور والد کے دل سے اترے ہوئے تھے ایک عجیب قسم کی بے چینی محسوس کر رہے تھے اس لئے بنا بھی سب انھیں کو رہے تھے۔ جب دولھاؤں کی طلبی اندر ہوئی تو یہ بہت شرمائے لیکن بڑے بھائی کو اندر جاتے دیکھ کر ان کی ہمت بندھی اور یہ بھی ساتھ ساتھ لگ گئے۔ ڈیوڑھی پر بہنیں چھیاں ملیں۔ انھوں نے بھی خوب چھیڑا اور انھیں اپنے کمرے تک پہنچا کر نیچے چلی گئیں۔

گھڑی نے ٹن ٹن کر کے چار بجائے۔ چھوٹے صاحب نے انگڑائی لے کر بیوی کو اور بھینچا۔ "ارے بھائی یہ تو بتاؤ کہ تمھاری بہن کو بھابی جان کہوں یا بڑی سالی

144

www.taemeernews.com

کا رشتہ رکھ کر آپا جان کہوں ؟"

احمدی جو ابھی تک شرم کی وجہ سے جی ہاں یا جی نہیں میں جواب دے رہی تھی ایک دم آنکھیں پھاڑ کر ڈرتی ڈرتی آواز میں بولی تو آپ ..... آپ ....." چھوٹے صاحب جن کو بڑی سخت نیند آ رہی تھی۔ اور جو برابر جاگنے کی کوشش کر رہے تھے آدھی سوئی اور آدھی جاگتی آواز میں بولے ۔ " ارے کہاں بھاگی جاتی ہو۔ اللہ اللہ کر کے تو تمھیں منایا تھا۔ اب تم ہو کہ بھاگی جاتی ہو....." خدا کے لئے بتایئے ..... آپ کون ہیں ؟"

"تم بڑی شریر ہو تمھیں اب بھی معلوم نہیں کہ میں کون ہوں"۔

"آپ بڑے بھائی ہیں کہ چھو ..... ٹے ..... اللہ جلدی بتایئے .....!"

دلہن کی آواز کانپ رہی تھی۔ دولھا نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ "کیوں۔ کیوں! یہ تو میرا ہی کمرہ ہے"۔ گھبرا کر چاروں طرف نگاہ ڈالی۔" واہ یہ تو میرا ہی گھنٹہ ہے۔ فضول تم مجھے ڈرا رہی ہو"۔

میں احمدی ہوں بڑی بہن ..... آپ بتایئے کہ آپ کون سے بھائی ہیں ؟"۔ "نہیں تم جھوٹ کہہ رہی ہو"۔ چھوٹے صاحب لحاف میں سے نکل پڑے اور پھر دلہن کی موجودگی دوسری طرف محسوس کر کے اپنے کو چھپا لیا۔ ان کی آواز میں خوشامد بھی تھی کہ خدا کے لئے کہہ دو کہ تم چھوٹی بہن قادری ہو۔

میں جھوٹ نہیں بول رہی"۔ دلہن نے کہا۔

دونوں ایک پلنگ پر بیٹھ گئے۔ چند لمحے تک ایک دوسرے کا منھ ایک عجیب خوف اور پریشانی سے دیکھتے رہے۔ عقل تو گویا وہاں تھی ہی نہیں اب تو حس بھی مر چکی تھی۔ دلہن پہلے ہوش میں آئی اور ہائے اللہ اب کیا ہوگا کہہ کر منھ چھپا لیا۔ چھوٹے صاحب آہستہ سے پلنگ پر سے اترے۔ کپڑے

www.taemeernews.com

پہنے اور کمرے سے نکل گئے۔ دلہن زور سے پکاری "سنیئے تو" لیکن یہ سیدھے چلے گئے اور جا کر بڑے بھائی صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ سو رہے تھے اور سمجھے کہ دیر ہو گئی اور لوگ ان کو جگانے آئے ہیں۔ جھنجھلا کر اٹھے اور دو منٹ میں تیار ہو کر باہر نکلے۔ چھوٹے بھائی کو اس طرح بدحواس دیکھ کر خیریت پوچھی۔

"بھائی صاحب!..... بھائی صاحب!!" آواز حلق میں پھنس گئی۔ "بھائی صاحب دلہن بدل گئی ہیں!" بڑے نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا "عورتوں سے غلطی ہو گئی!" بڑی مشکل سے پھر چھوٹے نے کہا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے کا منھ تکنے لگے۔

بوندوں نے انھیں ہوشیار کیا اور وہ آہستہ آہستہ مندر کی طرف بڑھے بڑے بھائی خاموش اور ساکت تھے اور چھوٹے صاحب بے چین ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔

"بھائی صاحب! اب کیا ہو گا؟"

"تمھیں تحقیق خبر ہے؟"

"خود دلہن نے مجھ سے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو گا؟"

"جو ابا جان کہیں گے اور کیا"

"ابا جان"۔

"میں تو ہرگز....."

"اچھا یہاں مینھ میں بھیگنے سے کیا فائدہ نیچے چلو"۔ دونوں نے آہستہ آہستہ زینہ سے نیچے اترنا شروع کیا۔ بڑے بھائی نے مڑ کر کہا۔ "ہر ایک سے ذکر کرتے نہ پھرنا۔ فضول ہنسی ہو گی۔" "مجھے پہلے ابا جان سے ذکر کر لینے دو"۔

www.taemeernews.com

"اور جو انھوں نے بدل لینے کو کہا۔؟"

"پہلے سے ہی کہنے لگے انھوں موقع تو دو"۔ بڑے نے ڈانٹا۔ چھوٹے غریب نے پہلی دفعہ عورت کو آغوش میں لیا تھا اپنی غزلیں سنائی تھیں یہ تو پہلے ہی سے بغیر دیکھے اپنی بیوی پر عاشق ہو چکے تھے۔ اور باپ کو بھی جانتے تھے۔ بیچارے کی حالت قابل رحم تھی۔ بڑے بھائی جو عورت کے معاملے میں اتنے انجان نہ تھے اور دنیا دار بھی تھے خاموش تھے۔

چھوٹے باہر سے اندر آئے تو ڈیوڑھی میں کھڑے رہے۔ ماں کے پاس جائیں یا نہ جائیں۔ بھائی نے منع کر دیا تھا کہ کسی سے ذکر نہ کرنا معلوم ہوگا تو ناراض ہوں گے۔ لیکن ہمت کر کے اندر چلے گئے۔ ماں سامنے گاؤ تکیہ سے لگی ہوئی سو رہی تھیں۔ جا کر آہستہ سے جگایا۔ انھوں نے گھبرا کر آنکھیں جو کھولیں تو بیٹے کے منھ پر جمی کی جمی رہ گئیں۔

"اے خیر تو ہے"۔

"دلہنیں بدل گئیں"۔

"دیوانہ ہوا ہے لڑکے!" ماں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "کہاں ہیں نوری منجھلی دلہن، جو لڑکوں کو اوپر لے گئی تھیں"۔ بیٹی کو زور سے آواز دی۔

"خدا کے لئے اماں جان کسی سے ذکر نہ کیجئے۔ بھائی صاحب نے منع کر دیا ہے۔ وہ ابا جان سے پہلے ذکر کر لیں۔ آپ بھی کسی سے میرا نام نہ لیجئے گا"۔ یہ کہہ کر چھوٹے اسی گھبراہٹ میں اٹھ کر باہر چل دیئے۔ اور ماں منھ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

www.taemeernews.com

وہ جل گئی

کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ جتنے منھ اتنی باتیں۔ وہ تھی ہی اس قابل۔ لیکن مجھ کو تو بہت ہی دکھ ہوا۔ وہ ایک بائیس سال کی جوان عورت تھی۔ جو جل مری۔

میں پولیس کا اردلی ہو گیا تھا۔ ورنہ میری کہاں پہونچ ہو سکتی تھی۔ میں نہ تو کوئی کانگریسی ہوں اور نہ کوئی افسر اور نہ ہی راجہ مہاراجہ۔ میں تو صرف اس کے کمپاؤنڈ سے کچھ دور ایک کرائے کی کوٹھری میں رہتا ہوں۔ ۱۲-۱۳ سال سے برابر اس کو دیکھتا آیا ہوں۔ اور اتفاق سے آج ہی صبح سے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے یہاں اردلی پر لگا تھا۔ اور انھیں کے ساتھ آج پہلی بار اس محل میں داخل ہوا تھا۔ مجھے محل کی خوبصورتی اور بڑائی کا وہ اندازہ باہر سے نہ ہو سکا تھا۔ جو اندر جا کر ہوا تھا۔ ہر طرف سنگ مرمر کا فرش تھا اور ہر کونے پر نوکر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ یہ وہ نوکر تھے جو ہمارے جیسے

148
www.taemeernews.com

کوارٹروں میں رہنے والوں سے بات بھی کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ قریب رہ کر بھی وہ ہم سے اور ہم ان سے بالکل ناواقف تھے۔ لیکن آج سب کے سب ہاتھ باندھے اور منھ لٹکائے کھڑے تھے۔

تھانیدار صاحب کے لئے بھی ایک درخت کے نیچے ایک کرسی بچھا دی گئی تھی۔ ان کی بھی گھر میں گھسنے کی مجال نہ تھی۔

ہماری موٹر کو دیکھ کر سول سرجن صاحب بھی باہر نکلے۔ اور اتنے میں کلکٹر صاحب بھی آ گئے۔ ان افسروں کے پیچھے پیچھے تھانیدار صاحب بھی اندر گئے اور ہمت کر کے میں بھی گھس گیا۔ یہاں اس محل میں واردات ہو گئی تھی۔

میں اس جنت میں جہاں ہر طرف قالین اور مخمل کے فرش تھے۔ ایک عجیب درد سا محسوس کر رہا تھا۔ واردات بملا دیوی سے تعلق رکھتی تھی۔

بملا جب کوئی آٹھ دس سال کی ہو گی تو سانولی سلونی گول مٹول سی لڑکی تھی۔ ہر وقت ہنستی رہتی تھی۔ صاف ستھری بہت اچھی لگتی تھی۔ جب وہ ٹہلنے جاتی تھی تو کبھی کبھار چند منٹ کے لئے ہم دونوں ایک ساتھ بھی کھیل لیتے تھے۔ وہ کیا ہی سندر گھڑیاں ہوتی تھیں۔ میری تو خوشی کے مارے بھوک بھی بھاگ جاتی تھی۔ میرا باپ دفتر میں چپراسی تھا اور اس کی کوٹھی نہیں محل کے قریب ایک کرایہ کے کوارٹر میں رہتا تھا۔ میں اس کے لئے رنگ برنگے پتھر اور طرح طرح کے گلدستے جمع کر کے رکھتا۔ کبھی تو وہ لے لیتی اور کبھی ٹھوکر مار کر آگے نکل جاتی۔ اگر وہ خود نہ نکلتی تو جو میم صاحب اس کے ساتھ ہوتی تھیں وہ کہہ دیتیں۔ "بملا آگے چلو ہم تمھارا چھوکرا بوائز کے ساتھ کھیلنا نہیں مانگتا۔"

وہ اونچے نیچے کی تمیز جو بچوں میں نہیں ہوتی۔ ایک دم ہمارے

149
www.taemeernews.com

درمیان آجاتی میں اس کے لئے راستہ چھوڑ دیتا اور وہ چلی جاتی۔ گرمیوں میں وہ ہمیشہ کہیں چلی جاتی اور میں وہیں پڑا رہ جاتا۔ اور اپنے جیسے چھوکرا بوائز کے ساتھ کھیلتا رہتا۔ اس کا انتظار مجھ کو ہوتا تھا یا نہیں، اب مجھے یاد نہیں لیکن جب وہ جاڑوں میں واپس آتی تو میرا دل خوشی سے اچھلنے لگتا تھا۔ میں تو قدمیں چھوٹے کا چھوٹا رہ جاتا۔ اور وہ ہر دفعہ مجھ سے لمبی ہو جاتی۔ اور اس کا جسم بھی خوب بھرنے لگا تھا۔ میری بہنوں سے وہ کتنی اچھی اور خوبصورت تھی۔ میری بہنیں دبلی پتلی، پیلی سی میلی ساڑی پہنے ہماری اکلوتی بکری کو چراتی گھومتی تھیں۔ اور وہ ریشمی ساڑی پہنے اگر نکل جاتی تھی تو ساری سڑک خوشبو سے مہک اٹھتی تھی۔ جب اس نے موٹر چلانا شروع کیا تو کس تیزی سے ایک پری کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتی تھی کہ میری نظر بھی اس کو ٹھیک سے نہ چھو سکتی تھی۔

ہمارے آس پاس جتنی کوٹھیاں اور محل تھے ہم ان سب کے باسیوں کو سلام کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ لوگ جواب دیں یا نہ دیں یہ ان کی مرضی تھی۔ لیکن میرا دل بہت چاہتا تھا کہ کم از کم وہ تو میرے سلام کے جواب میں گردن ہلا دے۔

جب اس کی شادی ہوئی تو وہ کوئی ۱۷ سال کی تھی۔ اس کے گھر کے سارے کمپاؤنڈ میں ایک ہفتہ تک بجلی کی روشنی جگمگاتی رہی۔ ہم کو اپنے کوارٹر میں دیا جلانے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ مہمان تو وہاں اتنے جمع تھے کہ کیا بتاؤں میں نے اتنی موٹریں کبھی ایک جگہ اکٹھا نہیں دیکھی تھیں۔ اتنے چمکدار اور خوبصورت کپڑے اور اتنی سجی سجائی اور سندر عورتیں۔ مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ میں جاگ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں۔ وہ جوان عورتوں کے

150 www.taemeernews.com

قہقہے اور وہ مردوں کے بانکپن۔ بس کیا بتاؤں کہ کیا تھا۔ راجہ اندر کے
ہاں اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہو گا۔؟

اور کھانے کی ہر وقت خوشبوئیں اڑتی رہتی تھیں۔ نہ معلوم کہاں تک
وہ خوشبوئیں پہنچتی ہوں گی۔ میرا تو یہ حال تھا کہ ہر وقت بھوک لگی رہتی تھی
اور آس پاس کے لوگوں کے منھ میں ضرور میری طرح پانی بھر بھر آتا ہوگا۔
میں سوچتا تھا کہ نہ معلوم یہ لوگ کیا کیا کھا رہے ہوں گے۔ میرا خیال پوری کچوری
سے آگے بڑھ ہی نہ سکتا تھا۔ جب میں چھوٹا تھا تو تیج تہوار پر ہمارے ہاں بھی
پوری کچوری یا میٹھا بن جاتا تھا۔ آج کل راشن کا زمانہ اور کھانا مہنگا ہو گیا
تھا۔ اب تو پوری کچوری کا ذکر ہی ذکر رہ گیا تھا۔ باپ کہتا کہ "ابھی دو
لڑکیوں کی شادی اور کرنی ہے۔"

ماں کہتی "لڑکے والوں سے جو روپیہ پائیں گے تو لڑکے کی بھولے آئیں
گے۔ اب مجھ سے کام نہیں ہوتا ہے۔"

باپ کہتا "میں نے پہلی دو لڑکیوں پر بھی روپیہ نہیں لیا۔ ان پر بھی
نہ لوں گا۔"

ماں بگڑ کر کہتی "پہلے کی اور بات تھی۔ سب کچھ سستا تھا۔ اب کی اور
بات ہے۔ اگر ہم نے روپیہ نہ لیا تو اشوک کا بیاہ کیسے ہو گا۔ اس کا سسر تو
ضرور لے لے گا۔ آج کون ہے جو بیٹی پر تھوڑا بہت نہ لے۔"

باپ غصہ میں اٹھ کر کھنکھارتا ہوا باہر چلا جاتا۔ میں ابھی سولہ سال
کا تھا۔ مجھ کو کہیں نوکری نہیں ملی تھی۔ باپ کو مہنگائی ملا کر ۴۲ روپیہ ملتے تھے
۵ روپیہ کوٹھری کا دے کر ہم پانچ جانوں کا گذارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ ماں اور
باپ میں ہر وقت کھانے پینے کا جھگڑا چلتا رہتا تھا۔ آخر وہ اتنا بڑھ جاتا کہ

151
www.taemeernews.com

باپ میری ماں کو خوب پیٹتا۔ اور پھر تاڑی پی کر مست ہو کر آن پڑتا۔ اور جو چار پیسے اس کے پاس ہوتے وہ بھی ختم کر دیتا۔ یہ قصہ مہینے میں دو چار بار نہیں آٹھ دس بار ہوتا تھا۔ ماں بیتے چنتی تھی اور گھاس کاٹتی تھی جب کہیں ہمارا گذارہ ہوتا تھا۔ مجھ کو پڑھانا بھی تھا۔ میں چھ جماعت تک پڑھا تھا جو کہیں محنت مزدوری مل جاتی کر لیتا تھا۔ نوکری ڈھونڈتے مجھے شرم آتی تھی لیکن اکثر وہ بھی اٹھانی پڑ جاتی تھی۔ میں اس امید میں تھا کہ میری مونچھیں ذرا جلدی نکل آئیں تو شاید کہیں ڈھنگ کی نوکری مل جاتی۔ یہی بات کرنل صاحب نے بھی کہی تھی کہ "چوکیدار ذرا اپنے لڑکے کو کھلاؤ پلاؤ، یہ چودہ برس کا لگتا ہے۔ ہم اس کو نوکری کیسے دے دیں"

اور کوئی جگہ ہوتی تو شاید میں بھکاریوں کی قطار میں بیٹھ کر بارات کا جھوٹا کھانا کھا بھی لیتا۔ میری نیت ان خوشبوؤں کو سونگھ سونگھ کر اتنی خراب ہو رہی تھی۔ شاید میں اکیلا اس بات میں مبتلا نہ تھا بلکہ مجھ کو اچھی طرح یاد ہے کہ کوارٹر والے سارے وقت اچھے اچھے کھانوں کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ مرد تو روز شام کو جا کر تاڑی میں مدہوش ہوتے اندر جو کچھ جیب میں ہوتا تو کوئی نہ کوئی اچھی چیز حلوائی کی ہاں سے کھا بھی آتے۔ مصیبت تو بچوں اور عورتوں کی آ گئی تھی۔ وہ بھوکے بھی رہتے اور ان کی پٹائی بھی خوب ہوتی۔ دوسرے مہینے قرضہ اور بڑھ چلا۔ لیکن وہاں بھلا دیوی کے محل میں کھانے کی ایک کان تھی کہ کم ہی نہ ہوتی تھی۔ ویسے تو قانوناً پچاس آدمیوں کی دعوت کی اجازت تھی لیکن جب کلکٹر صاحب برابر آتے رہتے ہوں تو ہزاروں سے کیا کم دسترخوان پر بیٹھتے ہوں گے۔

شادی بھی بھلا کی ایک راجہ سے ہوئی تھی اور بارات بھی جس شان سے

152
www.taemeernews.com

آئی وہ یاد ہے ہاتھی بھی تھے موٹریں بھی تھیں راجہ صاحب سونے اور ہیرے میں چمک رہے تھے۔ ان کی شکل ان کا جسم۔ رنگ سب کچھ چمکنے کے پیچھے ڈھکا ہوا تھا۔ بس وہ ایک سنہری ڈھیر معلوم ہو رہے تھے لوگ کہتے کہ یہ صرف بڑے راجہ ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی ملیں بھی چلتی ہیں آج کل کئی راجے ایسے بھی مل گئے۔ ہاں پہلے سنتے ہیں کہ راجہ ملوں کا کام نہیں کرتے تھے لیکن اب راج پاٹ میں کیا رہ گیا ہے۔ اگر راج کی شان رکھنی ہو تو ملیں چلانی ضروری ہو جاتی ہیں۔ اگر راجہ کی مل کہیں قریب ہوتی تو شاید مجھے بھی کام مل جاتا اور پھر ماں کو گھاس نہ چھیلنی پڑتی۔ آٹھ دن گزر گئے اور کملا ایک موٹر میں راجہ کے ساتھ بیٹھ کر چلنے لگی۔ ہر طرف رونا مچ گیا۔ بیٹی چاہے غریب کی ہو چاہے راجہ کی ہو۔ ہر شخص وداع کے وقت رونے لگتا ہے۔ کملا تو اتنا رو رہی تھی کہ اس کو اس طرح سسکتا ہوا دیکھ کر میں بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ کاش میں بھی ایک راجہ کی شکل میں ہاتھی کے ہودے پر بیٹھا ہوا اور اس سے شادی کرتا تو کبھی اس طرح رونے نہ دیتا۔ کملا کے اس طرح رونے سے اس کی بہت تعریف ہوئی۔ کیوں کہ پڑھی لکھی بے پردہ لڑکیاں کب اتنا روتی ہیں وہ رنگین کپڑوں اور حیا زروں میں لپٹی ہوئی تھی اور زیور تو اس پر اتنا لدا ہوا تھا کہ اسکے پاؤں نہ اٹھ سکتے تھے اور لوگ کہتے تھے ابھی تو آدھا بھی نہیں پہنے ہوئے۔ ادھر اس کی موٹر پر سے پیسے کے لیے غریبوں میں گتھم گتھا ہوئی۔ ایک چونی میرے بھی ہاتھ آئی۔ جو آج بھی

.... میرے پاس رکھی ہے....

دس دن کے بعد دلہن واپس آگئی۔ اور پھر کبھی سسرال نہیں گئی۔ نہ اس کا دولہا آیا۔ ہم سب کو تعجب ہوا۔ لیکن بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ نہ معلوم کیا بات ہوئی۔ ہم کو بھی کہاں سے خبر لگتی۔

کملا پہلے بھی موٹر چلانا جانتی تھی اور اب تو وہ بہت زیادہ خود ہی اکیلے

www.taemeernews.com

موٹر ادھر اُدھر لے جاتی۔ اسی طرح اس کی ماں بھی موٹر چلایا کرتی تھی۔ اور لے جاتی تھی اور اس کی بھاوج بھی۔ ان کے ہاں سب عورتیں اپنی اپنی موٹریں چلایا کرتی تھیں۔ اس شادی کے بعد اب بملا بھی اپنی ماں اور بہن کی طرح آزاد تھی۔ جہاں جی چاہتا جاتی اور جب جی چاہتا آتی۔ ہم تو اس کو اسی طرح بے روک ٹوک آتے جاتے دیکھتے۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہ اکیلی بہت کم جاتی ہے۔ کوئی نہ کوئی شہر کا بڑا افسر یا کوئی اور رئیس اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اکثر وہ دیر سے آتی۔ ہنستی۔ قہقہے لگاتی۔ مجھ کو خیال ہوتا کہ یہ بات کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کی ماں کیوں نہیں روکتی۔ کیوں اس کو سسرال نہیں بھیج دیتی جو بدنام ہو گئی تو پھر کیا ہوگا۔ تجھ کو تو معلوم ہے کہ اگر چنبیلی اپنی بہن کو میں ایسے گھومتے دیکھتا تو میری تو آنکھوں میں خون اتر آتا۔ لیکن یہ بھی غلط بات ہے۔ میری بوا کے داماد نے اپنی بیوی کو کوٹھے پر بٹھا دیا۔ تو ظاہر میں تو ہم ان سے ملتے جلتے نہیں۔ ویسے میری بوا کی لڑکی جب کبھی کبھار ہم کو کھانے پینے کی چیزیں بھیج دیتی ہے تو ہم چپکے سے رکھ لیتے ہیں۔ لیکن بوا کہا کرتی اس کا داماد اس بات کا ڈھونگی پہلے تو چپکے چپکے پیشہ کراتا رہا۔ پھر جب بات کھل گئی تو کھلم کھلا کروانے لگا۔

اور اب تو اس نے دو شادیاں اور کر لی ہیں اور خوب ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ پھر اس بملا کو کیا ضرورت ہے۔ اس کے پاس عزت بھی ہے اور دھن بھی ہے وہ کیوں ماری ماری گھومتی ہے۔ کبھی کوئی افسر ہے تو کبھی کوئی ملٹری اکیڈمی کا لڑکا۔ مجھ کو کتنا دکھ ہوتا۔ اگر وہ معمولی رنڈی ہوتی تو ایک بار تو میں بھی اس سے مل آتا۔ لیکن میں کہاں سے موٹر لاتا۔ اور اسکو گھماتا۔ میرا ارمان اب بھی دل کا دل ہی میں رہ جاتا۔ میری اس محل میں بالکل پہونچ نہ تھی۔ میرا دل بہت چاہتا تھا کہ میں

154
www.taemeernews.com

معلوم کروں کہ اس کی زندگی کیسے گزرتی ہے۔ یہ اپنے پتی کے یہاں کیوں نہیں جاتی۔ کیا اس کی لڑائی ہوگئی۔ الگ ہوگئی ہے تو کس بات پر۔ اتنی اچھی شکل تو اس کی ہے۔ پھر کیا بات تھی۔ اور اب کیوں، ہر تھوڑے دنوں کے بعد ایک نئے آدمی کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ کبھی مرد ایک ہاتھ سے موٹر چلاتا ہوتا اور دوسرا ہاتھ اس کی کمر میں۔ اور اس کا سر اس مرد کی گود میں۔ کبھی کمپاؤنڈ میں موٹر داخل ہونے سے پہلے ٹھہر جاتی اور دونوں چمٹ کر اور ایک دوسرے کو چوم لیتے۔ ایک آدمی ہو تو نوئی سمجھے بھی۔ یہ ہر چند ماہ بعد ایک نیا آدمی کیوں۔ اور پھر وہی آدمی الٹ پلٹ کر بھی حاضر ہیں۔ میرا دماغ چکرا جاتا اور میں بملا کے عاشقوں کی گنتی نہ رکھ سکا۔ اگر یہ ایسی تھی تو اس کے دو بھائی زندہ تھے۔ وہ کیوں نہیں روکتے۔ لیکن خود ان کی بیویاں اکثر اکیلی آتی جاتی تھیں۔ شاید ان لوگوں کے ہاں چلن ہی ایسا ہو۔ پر آنکھوں دیکھے بھی یقین نہیں آتا تھا۔ جس طرح کسی صاف ستھرے آدمی کو دیکھ کر یہ خیال نہیں آتا کہ وہ کبھی ٹٹی پیشاب کو بھی جاتا ہوگا۔ اسی طرح ان عورتوں کو دیکھ کر ایسا ویسا شبہ کرنا بُرا معلوم ہوتا تھا۔ جو ریشم میں ملبوس اور نک سک سے درست ہوں مجھ پر ہی کیا ہے۔ میں نے کتنے لوگوں سے بات کی ہے۔ ہم سب ہی یہ سوچتے ہیں کہ جیسے بھگوان ہم سے اونچے ہیں ویسے ہی یہ لوگ بھی ہم سے اونچے ہیں۔ جو یہ پچھلے جنم میں نیک نہ ہوتے تو اس جنم میں کیوں اس آرام کی زندگی بسر کرتے۔

اور ہم نے پچھلے بہت پاپ کیے ہوں گے۔ کیا پاپ کیے ہوں گے۔ کیا بملا آئندہ جنم میں چپراسی کا لڑکا بنے گی۔ اور میں بملا۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہم دونوں نے پچھلے جنم میں ایک سے پاپ کیے ہوتے تو ہو سکتا تھا کہ ہماری

بھینٹ ہو جاتی۔ اور اب پھر وہی ہوگا۔ میں بملا بن کر پاپ کروں گا۔ وہ چپراسی کا لڑکا بن کر پاپ کرنا بھی چاہے گی تو نہ کر سکے گی۔ میں خود کیا پاپ کر سکتا تھا۔ پیسہ تو پلے نہ تھا۔ پاپ کیا کرتا۔ ہاں کبھی کبھی چوری سے ادھر ادھر سے لکڑی کاٹ لاتا تھا۔ پھر یہ بھی کوئی پاپ تھا۔ پاپ کرنے کے لئے محل، موٹر اور ادھر ادھر گھومنے کی ضرورت تھی۔

ہم اوپر کی منزل پر گئے۔ پھر سہ منزلہ پر چڑھے اور ایک بہت بڑے کمرے میں ایک ہلکی چراند آئی۔ اور سامنے پلنگ کے نیچے ایک جلی ہوئی عورت پڑی تھی۔ چہرہ اس کا صاف تھا۔ اور میری نگاہ اس پر جم گئی۔ ابھی تک لپ اسٹک لگی ہوئی تھی۔ گو وہ بری طرح جھلس گئی تھی۔ کپڑے جل جانے سے وہ ننگی بھی تھی۔ ایک چھاتی کالی ہو گئی تھی۔ اور ایک ٹانگ جلنے کی وجہ سے سکڑ گئی تھی۔ اور بڑے برے انداز میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ بملا کے بھائی نے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے انگریزی میں کہا کہ ان لوگوں کو ہٹا دو۔ مجھ کو اور تھانیدار کو پوائنٹ کر کے باہر نکال دیا گیا۔ تھانیدار تو اپنی جھینپ مٹانے کو اپنا سینہ تان کر پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔ اور میں جا کر نوکروں کے جھنڈ میں کھڑا ہو گیا۔ وہاں یہی باتیں ہو رہی تھیں۔

وہاں ایک آیا تھی۔ بڑھیا سی۔ وہ زمین پر بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ "کیسے مر گئیں راج کماری۔ یہ تو بہت ہی برا ہوا۔ اب چیرا پھاڑی ہو گی۔"

"کیا بتاؤں بھیا۔ وہ تو کہو کہ میں چوکسی کرتی رہتی تھی۔ ورنہ پہلے ہی آگ لگ جاتی۔ کل مجھ کرم جلی کو ایسی نیند آئی کہ پتہ ہی نہ لگا۔"

"وہ کیسے"

156 www.taemeernews.com

"گیارہ بجے تو کھانے کے بعد اور گئیں۔ کل دعوت تھی۔ ریلوائی کے بڑے صاحب اور ان کی میم صاحب آئے تھے۔ ہر گریڈر صاحب تو یہاں ہی ٹھہرے تھے۔ اور بھی لوگ کھا پی کر سب سونے چلے گئے۔"

"پی کر"

"ہاں بھائی" اس نے آنسو پونچھے۔ "میں نے کتنی بار منع کیا کہ اتنی نہ پیا کرو۔ بوتلیں چھپا دیتی تھی۔ وہ مجھ کو مارتی تھیں۔ پھر بھی نہ دیتی تھی۔ بھگوان کرے ہر گریڈر پر بجلی گرے۔ یہ رات کو نہ معلوم کتنی بوتلیں لے آیا۔"

"تین بجے تو میں نے اس موئے کالے کو بٹیا کے کمرے سے نکالا۔ پھر میری آنکھ لگ گئی۔"

"پھر کیا ہوا۔" وہ شراب بھی پیتی تھی مجھے یقین نہ آتا تھا۔

"ہوتا کیا۔ اس کے جانے کے بعد بٹیا نے لگتا ہے اور شراب پی۔ پھر سگریٹ جلا کر سو گئی۔ اور جل گئی۔" بڑھیا رونے لگی۔

"کیا تمھاری بٹیا شراب پیتی تھی۔"

"شراب! وہ تو افیم کی سوئی بھی روز لگاتی تھی۔ اور کوکین بھی کھاتی تھی۔ ناس جائے اس پرانے سول سرجن کا اس نے افیم کی سوئی کی عادت ڈال دی تھی۔"

"اور کوکین۔"

"وہ کوئی بمبئی کا سیٹھ تھا۔ سب نے اپنا کام نکال لیا۔ ہائے میری تو بٹیا۔۔۔۔۔۔ چاہے مارتی تھی۔ پر دیکھ بھال تو وہی کرتی تھی۔ اب میرا بڑھاپے میں کون ہے۔" اور وہ رونے لگی۔

"پر ماتا جی نے ایسی عادتیں کیوں ڈالنے دیں۔ اور ان کے بھائی بھی تو

157
www.taemeernews.com

تھے ۔"

"ارے یہاں کون شراب نہیں پیتا ۔ ماتا جی خود شراب پیتی ہیں ۔ انھیں سے تو بٹیا نے بھی سیکھی ہے ۔ ہائے میری بٹیا ۔" وہ آپ ہی دراصل اپنے سے باتیں کر رہی تھی ۔ اپنے غم میں اسے یہ احساس نہ رہا تھا کہ اپنی بٹیا کی باتیں وہ کسی سے کر رہی تھی ۔

"اپنے پتی کے یہاں کیوں نہیں گئیں ۔"

بڑھیا نے میری طرف دیکھا ۔ اور پہلی بار اس کو احساس ہوا کہ میں باہر کا آدمی ہوں ۔ بولی ۔

"تم کو کیا تم جاؤ اپنے افسروں میں جا کر کھڑے ہو ۔"

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ "یہ تو بہت برا ہوا ۔ اب چیرا پھاڑی ہوگی ۔"

چند روز پہلے کی بات تھی کہ کچہری کی مرمت کرتے وقت دیوار گر گئی تھی ۔ اور دو مزدور نیچے کچل کر مر گئے تھے ۔ جب ان کے رشتہ داران کو روتے پیٹتے چلاتے لے گئے تھے ۔ تو انھیں تھانیدار نے مجھ کو اور جھنڈا سنگھ کو ان کو گرفتار کرنے کو بھیجا تھا ۔ خیر وہ بات تو الگ رہی کہ ان سے ہم لوگوں کو کیا ملا ۔ پر جب ان کی ڈاکٹری ہوئی تو میں نے بھی کھڑکی کے باہر سے جھانک کر دیکھا ۔ کتنا دکھ ہوا ۔ سول سرجن صاحب نے ان کے جسم کو ٹکڑوں میں کاٹ کاٹ کر دیکھا ۔ بھلا کیا ضرورت تھی ۔ ہم کانسٹبلوں کو بھی کتنا برا لگا ۔ وہ تو سب کی آنکھوں کے سامنے کی واردات تھی اور کسی کیپٹ کا سوال نہ تھا ۔ یہ تو بند کمرے میں جلی ہے ۔ کسی نے زہر ہی دے دیا ہوا اور پھر آگ لگا دی ہو ۔ اب اس کی میری بھلا کی چیرپھاڑ ہوگی ۔ یہ سوچ کر میرا عجیب حال ہوا ۔ میں

158 www.taemeernews.com

نے ایک ستون کو پکڑ لیا۔ ورنہ شائد گر پڑتا۔

"چیرا پھاڑی نہیں ہوگی۔ اتنے افسر بیٹھے ہیں۔ سول سرجن صاحب اور بریگیڈیر صاحب، سب نے ماتا جی سے وعدہ کر لیا ہے کہ چیرا پھاڑی نہیں ہوگی" ایک بیرا نے ڈانٹ کر جواب دیا اور مجھ سے بگڑ کر چلا گیا کہ جیسے میں ہی مجرم ہوں۔ اور اس کے پیچھے ایک ایک کر کے سب نوکر چلے گئے اور پھر صرف وہ بڑھیا رہ گئی۔

میری آنکھوں کے سامنے بملا کی یاد سنیما کی تصویروں کی طرح گزر رہی تھی۔

159
www.taemeernews.com

انصاف

رام سنگھ راجہ بہاری لال کے چپراسی کا لڑکا تھا۔ اور اس کی بچپن کی شرارتیں سب کو اتنی پسند تھیں کہ راجہ جی کے کان تک بھی اس کی خبر پہنچ گئی اور ایک دن راجہ صاحب نے خوش ہو کر رام سنگھ کے باپ سے کہا کہ تم اپنے لڑکے کو ہمارے لڑکے پریتم کے ساتھ کھیلنے کو لے آیا کرو۔ چپراسی غریب کی کوئی انتہا نہ رہی اور وہ سجا بنا کر دوسرے دن رام سنگھ کو محل میں لے آیا۔ راجہ جی اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ایک روپیہ مہینہ اس کا مقرر کر دیا کہ یہ رام سنگھ کے کپڑے لتے کا ہے۔ وہ ہمیشہ صاف ستھرا بن کر یہاں آیا کرے۔ رام سنگھ چند ماہ پریتم سے بڑا تھا اور نہایت ہوشیار اور شوقین بچہ تھا۔ ہر چیز فوراً اور جلدی سیکھ جاتا تھا۔ جو ماسٹر پریتم کو پڑھانے آتے وہ اس کو بھی راجہ جی کے حکم سے سبق دے دیا کرتے اور جب امتحان لیتے پریتم کے پرچے ہمیشہ رام سنگھ سے بُرے نکلتے۔ لیکن استاد راجہ صاحب کے خوف سے اور اس

160
www.taemeernews.com

خیال سے پریتم بڑے آدمی کا لڑکا ہے اس کو زیادہ نمبر نہ دیں تو اپنی نوکری چھوٹ جائے گی۔ ایمان سے کام نہ لیتے۔ اور بیچارے رام سنگھ کو ہمیشہ نیچے کر دیا کرتے۔ رام سنگھ کا دل بہت کڑھتا۔ اس کو اچھی طرح معلوم ہوتا کہ اس نے پریتم سے سوال زیادہ ٹھیک کئے ہیں اور املے غلطیاں بھی کم ہیں لیکن پھر بھی نمبر پریتم سے کم ملے ہیں۔ کیوں کہ بچہ تھا۔ ابھی اس کو یہ معلوم نہ تھا کہ دنیا میں لوگ اس قسم کی باتیں بھی کرتے ہیں کہ روپیہ والوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ اور غریبوں کو جان کر تکلیف دیتے ہیں۔ اس لئے وہ اکثر پریتم سے لڑ بھی بیٹھتا تھا پریتم بھی بڑا چالاک تھا۔ اس کو حساب وغیرہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تو رام سنگھ کی کتاب میں سے نقل اتارا کرتا تھا۔ اگر رام سنگھ اس سے روٹھ جاتا تھا تو وہ اس کو منا لیا کرتا تھا۔ ایک دن جب دونوں کا حساب کا امتحان ہوا تو رام سنگھ بہت خوش تھا کہ اس کے سب سوال ٹھیک تھے اور پریتم بہت رنجیدہ تھا کہ اس کے ۷ میں سے صرف دو ہی سوال ٹھیک تھے اور جب پنڈت جی نے نمبر دئے تو پریتم کے ۱۰۰ میں سے ۸۰ اور رام سنگھ کے ۷۰ تھے۔ رام سنگھ گھبرا گیا بگڑ کر کھڑا ہو گیا کہ پنڈت جی آپ میری اور پریتم دونوں کی کاپیاں دے دیجئے میں راجہ جی کے پاس جا کر انصاف کراؤں گا۔ پنڈت جی جو کبھی کاپیاں واپس نہیں کیا کرتے تھے دینے سے صاف انکار کر گئے۔ اور رام سنگھ جو ابھی تک غصہ اور جوش میں بھرا ہوا تھا۔ اور کون ایسا لڑکا ہوتا جو اس جگہ چپ بیٹھا رہتا۔ وہ اٹھ کر گیا اور پنڈت جی کی میز پر سے کاپیاں اٹھا کر لے آیا۔ اور کہنے لگا "پنڈت جی یہ کاپیاں میں یہاں لے آیا ہوں۔ اور راجہ جی کے پاس لے جا رہا ہوں۔ آپ کو میں نے اس لئے بتا دیا کہ چوری سے میں لے جاتا تو ٹھیک نہیں ہوتا۔"

راجہ جی نے جو رام سنگھ کا منہ تمتمایا ہوا دیکھا تو پاس بلا کر پیار سے پوچھا۔

"کہو رام سنگھ کیا ہو گیا"

"راجہ جی دیکھیے میں یہ کاپیاں لایا ہوں۔ میرے سب سوال ٹھیک ہیں اور پنڈت جی نے صرف ۰۰ نمبر دیئے ہیں۔ اور بھیا کے صرف دو سوال ٹھیک ہیں اور ان کو ۸۰ نمبر دیئے ہیں۔"

راجہ اس وقت ایک ناول پڑھ رہے تھے اس لیے بولے کہ "اچھا یہاں رکھ جا۔ ہم پنڈت جی سے پوچھ کر انصاف کریں گے۔" رام سنگھ کے جانے کے بعد انھوں نے پنڈت جی کو بلایا اور پوچھا کہ رام سنگھ کو نمبر کم کیوں دیئے وہ یہاں روتا ہوا آیا تھا۔"

پنڈت جی ہاتھ باندھ کر بولے۔ "حضور راجہ جی اب آپ سوچیے کہ یہ کمین کا بچہ آپ کے بچہ کے ساتھ پڑھتا ہے آپ کا حکم ہے۔ ہم پڑھاتے ہیں۔ ہر بات میں بھیا کی برابری کرتا ہے۔ نیز اس قدر ہے کہ جس چیز کو ایک دفعہ یاد کرلے کبھی نہ بھولے۔ اب اگر یہ لڑکا پڑھ گیا تو کل کو کوئی بڑی نوکری کرلے گا اور حضور یہ کمین چپراسی کا لڑکا بھیا پریتم کے برابر ہو جائے گا۔ اور پھر کسے خبر ہے کہ یہ ان کا افسر بن کر یہاں آئے اور بھیا کو اس کے حکم کے آگے سر کو جھکانا پڑے۔ حضور آپ کا حکم ہے۔ ہم پڑھاتے ہیں اور کیا کر سکتے ہیں کہ نمبروں میں اس کو پیچھے رکھتے ہیں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں ٹھیک نمبر دے دیا کروں۔"

راجہ صاحب کچھ دیر سوچ کر بولے۔ "ہاں پنڈت جی کہتے تو ٹھیک ہو۔ میری غلطی ہے اب اس لڑکے کو پڑھنا بند کر دینا چاہئے۔ کمین لوگ ویسے ہی آج کل بہت بڑھ گئے ہیں۔ ان لوگوں کو زیادہ پڑھنے لکھنے ہی نے تو بگاڑا ہے۔"

پنڈت جی نے جواب دیا۔ "حضور کو پرماتما جیتا رکھیں۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ اب رام سنگھ بارہ برس کا ہو گیا ہے۔ اب اس کو پڑھنا لکھنا ختم

162 www.taemeernews.com

کروا دینا چاہیئے۔"

راجہ صاحب نے رام سنگھ کے باپ کو بلا کر کہا کہ "ہم نے رام سنگھ کے ساتھ اتنے سلوک کیئے کہ اپنے بیٹے کی برابر رکھا لیکن وہ کمین نہایت احسان فراموش نکلا اور یہی نہیں کہ پریتم کی وہ برابری کرتا ہے بلکہ پنڈت جی کی بے عزتی کرتا ہے اور آج ان سے خوب لڑا۔ ایسے منھ زور لڑکے کو اب ہمارے محل میں مت لانا۔"

رام سنگھ کا باپ روتا ہوا رام سنگھ کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ "کمبخت تو نے پنڈت جی سے زبان چلائی۔ اب تیرا یہاں کا آنا بند ہوگیا اور جو دو حروف پڑھ جاتا اس سے بھی گیا۔"

معصوم رام سنگھ جو راجہ کے انصاف کے انتظار میں کھڑا تھا اور راجہ کو بطور بھگوان کے سمجھتا تھا۔ اس کو یقین نہیں آیا کہ راجہ جی نے اس کے ساتھ ایسا سلوک کیا ہوگا۔ وہ فوراً راجہ جی کے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ لیکن اس کے باپ نے روک دیا کہ کیا میری روزی بھی چھڑوائے گا۔

رام سنگھ نہایت گھبرا کر کہنے لگا۔ "بابو قسم لے لو میں نے کچھ نہیں کیا۔ پنڈت جی ہمیشہ مجھے بھیا سے کم نمبر دیتے ہیں۔ اس لئے میں تو راجہ جی کے پاس انصاف کے لئے گیا تھا۔ اور کاپیاں بھی ساتھ لے گیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ راجہ جی بھی پنڈت جی کی طرح بے ایمان ہیں۔ چپراسی نے آگے بڑھ کر اس کا منھ آہستہ سے بند کر دیا۔ اور ڈر کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ "بیٹا ایسی بات زور سے نہیں کہتے وہ بڑے آدمی ہیں۔ ہم غریب ہو تمھاری ان کی کیا برابری۔ نمبروں سے کیا ہوتا ہے۔ کم ہوں یا زیادہ۔"

وہ بےچارہ ان پڑھ تھا وہ نمبروں کو سمجھا بھی نہیں تھا۔

163
www.taemeernews.com

رام سنگھ نے جل کر کہا۔ "ہوتا کیسے نہیں ہم کام اچھا کریں اور بُرے نمبر پائیں۔ اور پھر انصاف راجہ جی ایسا کریں کہ ہمارا پڑھنا بھی چھڑوا دیں۔"

باپ نے کہا کہ "یہاں تو چپ رہ۔ گھر چل کر ہی کہیو۔"

بے چارہ رام سنگھ کر ہی کیا سکتا تھا۔ چپکے چپکے روتا ہوا گھر چلا گیا۔

---

www.taemeernews.com

بے زبان

صدیقہ بیگم کی شادی میں بہت دقتیں پیش آرہی تھیں۔ اصل نسل کی سیدانی تھیں۔ باپ اچھے خاصے کھاتے پیتے خوش حال تھے۔ صورت بھی سکڑوں میں ایک تھی۔ پھر بھی صدیقہ بیگم کی شادی ابھی نہ ہوسکی تھی۔ تینتیس ۳۳ سال کی عمر ہو چکی تھی۔ ان کی ماں احمدی بیگم کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ صدیقہ بیگم اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔ دو بڑی بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ ان کی شادیوں میں کوئی مشکل نہ پیش آئی تھی۔ بڑی لڑکی کی شادی سترہ سال میں ہوئی اور منجھلی تو صرف ۱۴ سال ہی کی تھی کہ بیاہ ہو گیا تھا۔ یہ منجھلی بہن سے ۱۲ سال چھوٹی تھیں۔ تو سارا بچپن بس ایسے گزرا کہ جیسے لڑکی صرف یہ اکیلی ہی ہو۔

پیغاموں کی بھی کمی نہ تھی۔ قریب کے رشتے میں اول تو کوئی لڑکا ہی نہ تھا اور جو تھے بھی تو وہ یا تو اتنے غریب تھے کہ ان کا خیال ہی ناممکن

www.taemeernews.com

تھا۔ یا جو ایک آدھ کھاتے پیتے تھے تو اُن کا چال چلن ٹھیک نہ تھا اور جو زیادہ پڑھ گئے تھے وہ خاندان کے باہر شادی کے خواہاں تھے۔

غیروں کے جو پیغام آتے تھے انیں کہیں تو حسب نسب نہیں ملتا تھا۔ کہیں لڑکا عمر دار۔ کہیں دو ہاجو۔ ۔ ۔ کہیں بیوی بچوں والا۔ جو دو ایک پسند بھی آئے تو وہاں شرطیں اور تھیں کہیں تو لڑکے والے کہتے تھے کہ ہم پہلے لڑکی کو دیکھ لیں پھر بات پکی کریں گے۔ کہیں صدیقہ بیگم کی لاعلمی پر بات ختم ہو جاتی۔ غرضکہ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی بات نکل آتی تھی ہر طرف لڑکے لڑکیاں بیاہے جا رہے تھے۔ لیکن صدیقہ بیگم ابھی تک کنواری ہی بیٹھی تھیں۔

برسوں سے ایک نئی لہر دلّی کے کونے کونے میں دوڑ رہی ہے لیکن پھر بھی بہت گھر ایسے مل جائینگے جہاں نہ کسی آندھی کا گذر ہے اور نہ کسی زلزلہ کا اثر ہے۔ وہی وضعداری وہی باہر کی بیٹھک۔ وہی شام کا مجمع اور وہی پُرانا اندرون خانہ چل رہا ہے۔

اسکول کی تعلیم تو خیر حامد حسن کے ہاں ہوتی۔ اُنکے ہاں تو لڑکے تک نے خدا کے فضل سے صرف علم دین ہی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ پہلے حامد حسن نے اسکو قرآن حفظ کروایا۔ پھر فارسی پڑھوائی۔ اور پھر جب وہ بڑا ہو گیا تو دیوبند بھیج کر عالم بنوایا۔ اب وہی سارے گھر کی دیکھ بھال اور جائداد کا انتظام کرتا تھا۔ شادی بھی اُس کی شریف اور اچھے امیر گھرانے میں ہوئی تھی۔ اب اللہ رکھے چار بچوں کا باپ تھا۔ حامد حسن صاحب کا نام بڑا تھا اور خاندان بھی ہزاروں میں ایک تھا۔ لیکن پھر بھی صدیقہ بیگم کی شادی نہ ہو سکی تھی۔

لڑکیوں کی تعلیم کے حامد حسن بہت خلاف تھے (قرآن شریف، دو ایک دینیات کی کتابیں صدیقہ بیگم کو پڑھا دی گئی تھیں۔ حامد حسن اس سے زیادہ تعلیم کو بُرا خیال کرتے تھے۔ باپ دادا کے نام پر جان دینے والے اُن کے بنائے ہوئے رسم و رواج کی پابندی اسی طرح کرتے تھے جس طرح ڈپٹی کمشنر بہادر کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔ کہاں مذہب کی حد ختم تھی اور کہاں رسم و رواج کی سرحد تھی اسکی چھان بین نہ انھوں نے کبھی کی اور نہ کرنا چاہتے تھے۔ بس شرافت کا ایک معیار جو بزرگ بنا گئے تھے وہ اُنکا پیمانہ تھا۔ اُسی سے ہر چیز کا ناپ تول کیا کرتے تھے انھیں نے نئے

166 www.taemeernews.com

خیالوں سے اپنی دنیا کو بالکل الگ رکھا تھا جس میں انھیں کے ہم خیال دوچار اور شریف بھی شامل تھے۔ یہ آپس میں مل کر محفل جماتے۔ حقّہ چلتا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے۔ اور ساتھ ہی پُرانے زمانے کی چمک اور آجکل کے زمانے کے اندھیر پر آنسو بہایا کرتے تھے۔ حامد حسن بہت خوش قسمت تھے) بیوی بالکل ہم خیال ملی تھیں وہ بھی ۱۸۵۷ء کی دہلی کا جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔ ۹ برس کا لڑکا اندر گھر میں نہ آسکتا تھا۔ اور تو اور ہر عورت بھی گھر میں نہ جانے پاتی تھی۔ ہر کسی کے ہاں آنا جانا بھی وہ معیوب خیال کرتے تھے۔

بھائی سے اس بات پر لڑائی ہوگئی تھی کہ لڑکیوں کو گھر پر بھی تعلیم نہ دو۔ ایک بھتیجی سے اپنے لڑکے کی منگنی کی تھی مگر اس بات پر کہ لڑکی کو انگریزی مت پڑھاؤ منگنی توڑ دی اور کہا "میں گھر میں بہو لانا چاہتی ہوں، میم صاحب نہیں"۔

اپنی بات اور آن کی ایسی پکّی تھیں کہ پندرہ سال سے زیادہ ہوگئے تھے اکلوتے بھائی کی صورت نہ دیکھی تھی۔

صدیقہ بیگم کو اُن کی والدہ احمدی بیگم نے بالکل بھونرے میں پالا تھا۔ قریب سے قریب رشتہ داروں نے لڑکی کی صورت ٹھیک سے نہ دیکھی تھی۔ اپنی ہر ملنے جلنے والی سے صدیقہ کو پردا کرواتی تھیں۔ جس طرح خود اپنے کنوارپن میں رہی تھیں اُسی طرح بیٹی کو بھی رکھتی تھیں۔ بے مانگ کی چوٹی گندھواتیں۔ عطر تو بہت بڑی چیز ہے۔ پھول تک چھونے کا حکم نہ تھا۔ ہر ممکن کوشش اُسکو بچہ اور انجان بنا کر رکھنے کی کرتی تھیں۔ نہ اُسکی کوئی سہیلی تھی نہ کسی سے ملنا تھا نہ کسی سے جلنا۔ نہ کہیں آنا نہ کہیں جانا۔ سارا دن بیکاری میں گذر جاتا تھا۔ کبھی کچھ سی لیا تو سی لیا۔ بس یہی اُس کا مشغلہ تھا۔ بہنیں تھیں اول تو وہ عمر میں اتنی بڑی تھیں اور پھر دونوں حیدرآباد میں بیاہی تھیں۔ اُن سے بھی کبھی کبھار ملنا جلنا ہوجاتا تھا اور تو اور ایک بھانجی بھی جو عمر میں اِن سے چھوٹی تھی اُس کی بھی شادی ہوچکی تھی اور وہ بھی عورتوں میں برابر کی ہوکر بیٹھتی تھی۔ صدیقہ بیگم کے خیال میں وہ سب آزاد تھیں

167
www.taemeernews.com

اور اُن کو دیکھ دیکھ کر یہ رشک کھاتی۔ یہ پنجرے میں بند ہوئے ہوئے گھبرا گئی اور دعائیں مانگتی کہ اے خدا میری بیڑیاں بھی کاٹ چُک۔

جب کبھی رشتہ کی پھوپی رضیہ بیگم آجاتیں تو اُن کی طرف دیکھ کر وہ اور بھی ڈر جاتی۔ کہیں میرا بھی یہی حشر نہ ہو۔ رضیہ بیگم کوئی ساٹھ سال کی کنواری عورت تھیں۔ اب تک اُن میں ایک جھجک تھی۔ اکثر جگہ اُن کو دیکھ کر لڑکیاں اور نوعمر شادی شدہ عورتیں آپس میں کانا پھوسی شروع کر دیتی تھیں۔ رضیہ بیگم کو اپنی اس کمی کا احساس تھا اور بیچاری خود آتی جاتی کم تھیں۔ اور جو کہیں جاتی بھی تو ایسی جگہ چُن کر بیٹھتی تھیں کہ لوگوں کی نگاہ ان پر نہ پڑے۔

پھر صدیقہ بیگم اپنی سگی پھوپی ذکیہ خاتون کی طرف بھی دیکھتی تھی جو شادی کے مہینہ بھر بعد بیوہ ہوگئی تھیں۔ وہ نہایت دلیرانہ ہر جگہ جاتی تھیں جو منہ میں آتا کہتیں۔ بدقسمت ضرور تھیں لیکن کسی سے کم تو نہ تھیں۔ صدیقہ بیگم اپنے دل میں دونوں عورتوں کا مقابلہ کرتی تو ہر دفعہ اپنی بیوہ پھوپی کی زندگی کو ترجیح دیتی۔

جب کبھی اماں باوا کو گٹ گٹ کرتے سنتی یا اماں و ابا دبی دبی باتیں کرتے تو سمجھ جاتی کہ آج کل ایسا ویسا ذکر ہے تو کچھ امید بندھتی اور پھر جب سب خاموش ہو جاتے تو پھر سمجھ جاتی کہ پھر انکار کر دیا گیا۔ دل ہی دل میں ماں پر جھنجھلا پڑتی اور اس کی آنکھوں میں رضیہ پھوپی کی مسکین اور شرمندہ صورت پھر جاتی اور وہ کہتی۔ آخر اماں اتنی شرطیں کیوں لگاتی ہیں۔ کہیں مہر کی شرط ہے تو کہیں "خرچ پاندان" پر جھگڑا ہے۔ کسی کے باپ دادا میں نقص ہے تو کسی کی نانی میں۔ لیکن صدیقہ کہتی تو کس سے کہتی۔ ماں تو ماں تھی کوئی سہیلی نہ تھی۔ باپ سے تو اس کی روح کانپتی تھی۔ بھائی سے بھی جھجک تھی بھاوج

www.taemeernews.com

غیر تھی گھر میں جو مامائیں تھیں وہ بھی پرانی، نہ معلوم کس زمانے کی تھیں۔ عجیب مصیبت میں جان تھی۔

آج صدیقہ بیگم پھر اپنے کمرے کا دروازہ بند کئے کواڑ سے کان لگائے اپنی اماں اور بی صغرا بیگم کی باتیں سن رہی تھی۔ صغرا بیگم ایک شریف گھرانے کی غریب بیوہ تھیں۔ غربت سے لاچار ہو کر رفتہ رفتہ مشاطہ کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ چونکہ شریف عورت تھیں اور ہر گھر میں بے روک ٹوک آتی جاتی تھیں اس لئے رشتہ کرانے میں ان کو آسانی ہو جاتی تھی۔ صدیقہ بیگم جیسے جیسے ماں کی باتیں سنتی جاتی تھی۔ تیوری چڑھتی جاتی تھی۔ احمدی بیگم جل بھن کر کہہ رہی تھیں "اوئی بیوی یہ کہاں کا نیا طریقہ شریفوں میں نکلا ہے کہ لڑکی کو دیکھتے پھرو۔ ہمارے ہاں تو یہ رواج نہیں۔ ہماری شادی ایسے ہی ہوئی۔ میری اللہ رکھے دونوں بڑی لڑکیاں بیاہی گئیں ہو آئیں۔ کیا سارے ملک کے شریف ہی اٹھ گئے۔ جا کر لڑکے کی اماں سے کہنا کہ بیوی کیا ساری شرافت، شرم دھو کر پی گئیں۔ اپنی لڑکیوں کی شوق سے نمائش لگائیں، سودا کریں، ہماری لڑکی کافی گھر رہی سب کچھ ہے لیکن ہے محمد حسن کی بیٹی۔ اور امجد حسین کی پوتی۔ چودہ پشتیں نہیں اسی شہر میں ہو گئیں۔ کوئی ہم ایسے گرے پڑے نہیں ہیں کہ کوئی ہم کو نہیں جانتا۔ ہمارے ہاں کی لڑکیاں ملتی کہاں ہیں۔ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جو یہاں کی چوکھٹ کرتے ہیں۔ ہم تو اپنے نام پر مرتے ہیں۔ اے ہاں! میں سب کچھ جانتی ہوں۔ لڑکے ہی کی طرف دیکھ رہی ہوں اکیلا لڑکا ہے۔ چار سو کا کرایہ اس کا ہے۔ ڈھائی سو کا نوکر۔ خاندانی ہے نیک۔ میں سب کچھ ماننے کو تیار ہوں۔ لیکن یہ شرط میں کیسے گوارا کر دوں کہ

169 www.taemeernews.com

وہ لڑکی کو دیکھ جائیں اور پھر پیغام دیں۔ جو وہ دیکھ کر گئیں اور کہہ دیا کہ ہمیں لڑکی نہیں پسند۔ تو ان کا تو لڑکا ہے۔ ان کا کیا بگڑے گا۔ میں تو کہیں منھ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ مجھے عمر بھر کنوارا رکھنا منظور لیکن یہ مول تول تو مجھ سے نہ ہو گا۔"

"اے ہے بیگم تم تو بات بھی نہیں سنتیں"۔

"بات کیا سنوں" احمدی بیگم بات کاٹ کر بولیں "مجھ سے تو افسر جہاں جیسی بے غیرتی نہیں ہو سکتی۔ کہنے کو تو وہ میری عزیز ہیں لیکن جو کوئی جھوٹوں کہے تو وہ سبھوں لڑکیاں دکھا دیتی ہیں۔ منجھلی لڑکی کو تو سنتی ہوں کہ چار پانچ جگہ دکھایا۔ جب کہیں کسی نے جا کر قبولا۔ نا بوا مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔ نہ میں لڑکے کی ماں کو دکھاؤں نہ اس کی بہنوں کو۔

اتنے میں ایک ماما خبر لائی کہ رنگ محل سے سواریاں آئی ہیں اور پردے مانگے ہیں۔ جلدی سے دو چادریں پلنگ پر سے اٹھا کر ڈیوڑھی کی طرف چلیں اور ادھر احمدی بیگم بھی قرینہ سے ہو کر بیٹھ گئیں۔ اور صغرا بیگم سے بولیں۔ "اب ان کے سامنے ساری بات کھول دینا"۔

صغرا بیگم نے جواب دیا۔ "اے بوا کیا میں نے چونڈا دھوپ میں سفید کیا ہے ہے"۔

چار بیبیاں دو ادھیڑ عمر کی تھیں جو بہنیں معلوم ہوتی تھیں اور دو جوان تھیں۔ صحن سے ہوتی ہوئی قریب آئیں۔ ایک دوسرے سے گلے ملیں۔ اور پھر فرش پر بیٹھ گئیں۔ بیٹھتے بیٹھتے ایک بولیں "واہ بہن جمعہ کو خوب میلاد بھی آئیں"۔

"دلہن کے چھوٹے بچے کا جی بہت ماندا تھا۔ اور پھر منا نی جی آج کل

نہیں ہیں۔ ایسا بھتیجے کا بیاہ کرنے گئیں کہ مہینہ بھر ہو گیا۔ شکل ہی نہیں دکھائی صدیقہ کی طبیعت الگ ماندی ہے۔ سر میں درد ہے اور لیٹی ہے۔ اے حشمت تم کیوں دبلی ہو رہی ہو۔ ابھی تو شادی ہوئی ہے۔ خوشی کے دن ہیں۔

"کیوں آپا صغرا یہاں کیا کر رہی ہو؟ صدیقہ بیگم کا کہیں سے پیغام لے کر آئی ہو؟" حشمت کی بڑی بہن مسرت نے پوچھا۔

"اے بیوی جہاں بیری ہوگی وہاں پتھر بھی آئیں گے"۔ صغرا بیگم نے تڑاخ سے جواب دیا۔

"تو خالہ جان پھر کیا ارادہ ہے۔ صدیقہ کی شادی کا تو بہت ہی ارمان ہے۔" مسرت بولیں۔

"لو بوا شادی کرنا مذاق ہے اور خاص کر آج کل۔ اول تو وہ گھرانے گھرانے ہی نہیں رہے۔ ہر جگہ کچھ نہ کچھ میل ہوتا جاتا ہے۔ نہیں بوا کسی خاص کا ذکر نہیں کرتی ہوں ..... کیا بتاؤں اسی دلی میں ایک نئی وبا نکلی ہے کہ لڑکی کو دکھاؤ۔ آخر ہماری بھی شادیاں ہوئی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں اور تو اور یہ بوا صغرا کہتی ہیں کہ عورتوں کو دکھانے میں کیا حرج ہے۔ میں کہتی ہوں حرج ہی نہیں۔ جو یہ صدیوں سے ہم خاندانی شرافت بنا کر بیٹھے ہیں تو وہ اسی دن کے لئے۔ آج کل تو نہ شرافت کی قدر نہ خاندان کی قدر۔ بس روپیہ ہو۔ اور جو گٹ پٹ ہو اب ہماری بہن نے جو حشمت کو دکھا کر کیا تھا تو حشمت کون سی خوش ہیں؟"

"کیا بری ہے حشمت کے میاں میں۔ اب یہ نہ خوش ہوں، تو ان کا اپنا قصور ہے۔ انھیں کس چیز کی کمی ہے۔ خاطر کرنے والا۔ محبت کرنے والا پیسہ والا اور کیا چاہیئے؟ یہ کہتی ہیں کہ اماں آپ میرا ذکر کیا کیجئے

171
www.taemeernews.com

آپ کو جو کرنا تھا کر چکیں؟ آپ کیا جانیں سوکن کا ساتھ۔ میاں کہتا ہے کہ میں اس بیوی کا منھ نہ دیکھوں لیکن ان کو سوکن کا بڑا درد ہے کہیں سنی ہیں بوا تم نے الٹی باتیں"۔ مسرت کی اماں بولیں۔

"اماں تم میرا ذکر ہر جگہ کیوں لے بیٹھتی ہو۔ خالہ جان بتایئے صدیقہ کی بات کہاں لگ رہی ہے؟"

"ابھی تو بیٹی ٹھیک نہیں ہوا۔ جہاں ایک آدھ لڑکا نظر آتا ہے تو وہی دکھاوے دکھاوے کا جھگڑا اور پھر طرہ یہ کہ کہتے ہیں پہلے دیکھ لیں۔ پھر بات پکی کریں گے"

"اے بوا تم مجھے تو کہنے بیٹھ گئیں کہ میں نے حشمت کو دکھا دیا۔ میں نے تو عورتوں ہی کو چپکے سے دکھایا تھا۔ لیکن ان کو تو کہو جو مردوں کو دکھا دیتی ہیں"

"ادئی بوا! وہ کون ہوتی ہیں؟" احمدی بیگم نے حیران ہو کر پوچھا

"کون ہوتی ہیں۔ صفدر جہاں کو تم نہیں جانتیں۔ انھوں نے تو بیٹی کو لڑکوں تک کو دکھایا۔ سامنے کواڑوں میں سے جھنکوا دیا"

"ہے ہے کہہ کر" احمدی بیگم نے سینہ پر زور سے ہاتھ مارا۔ اور لہرا کر بولیں "ادئی زمین نہ پھٹ گئی! میں تو بوا صدیقہ کو دو پیسہ کی سنکھیا کھلا کر سلا دوں لیکن یہ کام مجھ سے نہ ہو۔ اے کیا آمنے سامنے بٹھا دیا تھا؟ شابش ہے اس بے شرمی کو! لڑکی کو کمرے میں بٹھا کر لڑکوں کو کواڑوں سے جھکوا دیا۔ وہ تو خیر سمجھو کہ لڑکا راضی ہو گیا۔ اور بوا جو وہ راضی نہ ہوتا تو پھر اسی طرح دوسرے تیسرے کو جھکوائی چلی جاتیں؟ میرا تو ایسی باتیں سن کر رواں رواں کانپتا ہے۔ توبہ اللہ توبہ۔ خاک چاٹ کر کہتی

172
www.taemeernews.com

ہوں۔"

"اے ہے بیگم تم رہتی کس دنیا میں ہو! کس گھر میں لڑکیاں نہیں دکھائی جا رہی ہیں۔ صفدر جہاں نے وہی کیا جو ہزاروں کر رہے ہیں آج کل تو وہ وہ طریقے برتے جا رہے ہیں کہ سن کر اوسان خطا ہوتے ہیں۔ محمود خاں کے لڑکے کا پیغام ایک جگہ گیا۔ لڑکا اڑ گیا کہ بغیر دیکھے نہ کروں گا۔ لڑکا اچھا تھا۔ گھر پہ بلا کر دکھانا اچھا نہ سمجھا۔ ایک انگریزی دوکان پر لے جا کر لڑکی کو دکھا دیا۔" صغرا متاط نے کہا۔

"اور اس نقدری نے طباق سا منھ کھول کر دکھا دیا!" احمدی بیگم جل کر بولیں۔ "ہاں بوا ٹھیک ہے جب ماں ہی کو شرم نہ آئی۔ اور بیٹی کو دوکان پر لے کر پہونچ گئیں تو صاحبزادی تو پھر پڑھی لکھی تھیں تو پھر بوا میموں میں کیا برائی ہے؟ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالتی ہیں۔ اللہ نے اپنا فضل کیا تو یہاں بھی یہی ہو جائے گا۔"

"اے لو وہ تو سنا ہے کہ وہاں یہ شروع کر دیا ہے۔ سنجھلی لڑکی کی شادی جس طرح کی وہ تو بہت ہی شرمناک ہے"۔

"ہاں وہ جو نہ کریں کم ہے۔ کنواری لڑکیوں کو گھر سے دور۔ مدرسوں میں لڑکوں کی طرح بھیجنا۔ سائیکلوں پر چڑھوانا۔ بھلا ان کا گزر میرے گھر میں کہاں ہوتا۔ اسی لئے تو میں نے بھائی بھاوج سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ شادی ہوئی کیسے؟"

بالکل لڑکی کی پسند سے، لڑکی نے کہہ دیا کہ میں کروں گی تو اس سے۔ اماں باوا بھی خوش ہو گئے۔ سنا ہے وہ گھر میں آتا جاتا رہتا تھا۔ سال بھر میں کہیں جا کر شادی ہوئی۔"

www.taemeernews.com

"اور مجھ سے جو کوئی پوچھے تو ہونا بھی یہی چاہیئے" حشمت ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔

"اوئی لڑکی۔ اللہ اللہ کر۔ شرم نہیں آتی۔ کہیں میری صدیقہ کے سامنے ایسی باتیں نہ کر بیٹھنا۔ بھئی بیاہی تیاہی لڑکیوں میں اس کا ملنا پسند نہیں کرتی۔ اور بوا! میں جب یہ باتیں سنتی ہوں دل مسوس کر رہ جاتی ہوں۔ پوتی کے کرتوت دیکھ کر ہمارے ابا میاں کی روح کیا کہتی ہو گی۔ میں تو اپنی بھاوج کے ڈھنگ شروع ہی سے تاڑ گئی تھی۔ سولہ سال ہونے آئے نہ میں نے ان کی صورت دیکھی ہے۔ اور نہ خدا مجھ کو زندگی بھر دکھائے۔ ان کی ذلیل باتیں سن کر میں بس خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتی ہوں۔ جو آج کہیں ابا میاں زندہ ہوتے تو ان لوگوں کی مجال تھی کہ ایسی باتیں کرتے۔ اب سنتی ہوں کہ میری بھتیجیاں سڑکوں پر بے پردہ جوتیاں چٹخاتی پھرتی ہیں۔ اولاد کا کیا قصور ہے۔ جیسے پالو گے ویسا ہی اٹھیں گے۔ اب ہمارے بچے ہیں۔ مجال ہے کہ باپ کے سامنے کوئی ہوں تو کر جائے صدیقہ ہی کو لے لو۔ جہاں بٹھا دیا بیٹھ گئی۔ جیسا کھلا دیا کھا لیا۔

احمدی بیگم نے سب کو پان لگا کر دیئے اور بات جاری رکھتے ہوئے کہنے لگیں "اور اب تو جدھر دیکھتی ہوں یہی دیکھتی ہوں کہ لڑکیوں کو اس طرح نکال کر پھینکتے ہیں جیسے کوئی گھر سے کوڑا کرکٹ نکال کر پھینک دے۔ ہمارے وقتوں میں ہر سوں ناک رگڑ وانے تھے جب کہیں جا کر بیٹی دیتے تھے۔ اور بوا! بیٹی دیں تو دیں ساتھ ہی ہزار روپیہ کا دھندہ بھی کرتے لگے ہیں۔"

"ہاں بہن ٹھیک کہتی ہو۔ اب ہمارے گھر کے قریب حافظ جابل الدین کا بیوہ داکر رہی ہیں۔ کوئی بیس لڑکیاں تو دیکھ چکی ہیں۔ ہر ایک میں کوئی نہ

174 www.taemeernews.com

کوئی عیب نکال دیتی ہیں۔"

"کون حافظ جلال الدین؟" صدیقہ بیگم کی ماں نے گھبرا کر بات کاٹی۔

"سید ہیں۔ خاندان اچھا ہے۔ لڑکا بھی برا نہیں۔ لیکن اماں غضب کی ہیں"۔ مسرت جہاں نے بتایا۔ "اور یہی آپا صغرا ہی ان کو چھ سات لڑکیاں تو دکھا چکی ہیں"۔

"اوئی بوا صغرا! تم ایسا پیغام میرے گھر میں لائی ہو! شاباش ہے تمہاری ہمت پر!" صدیقہ بیگم کی اماں نے کلمہ کی انگلی کو اوپر کے ہونٹ پر غصہ اور حیرت سے رکھ کر کہا۔

"اے ہے بیگم تم بھی کن کی باتوں ....."

صدیقہ بیگم جو ابھی تک کان لگائے ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔ ماں کا لہجہ سن کر سب سمجھ گئیں۔ وہاں سے اٹھیں اور دھڑ سے جا کر پلنگ پر گر پڑیں اور سسکیوں سے رونے لگیں۔

۱۹۴۱ء

175
www.taemeernews.com

مرد و عورت

عورت ۔ ارے آپ پھر آگئے ۔

مرد ۔ جی ہاں

عورت ۔ ابھی کل ہی تو آپ شادی کرنے گئے تھے ۔

مرد ۔ گیا تو تھا

عورت ۔ تو پھر ؟

مرد ۔ تو پھر ؟

عورت ۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی دلہن صاحبہ کہاں ہیں ۔

مرد ۔ تم تو سچ مچ یہ چاہتی ہو کہ میری زندگی برباد ہو جائے ۔

عورت ۔ لیجئے یہ میں نے کب کہا ۔

مرد ۔ تو پھر تمہارا اور کیا مطلب ہے ۔ مجھ کو دق کرنے سے ؟

عورت ۔ مطلب ۔

176
www.taemeernews.com

مرد ۔ بنتی کیوں ہو۔ تم میرا مطلب خوب اچھی طرح جانتی ہو۔

عورت۔ اچھا۔ اب سمجھی۔ لیکن جناب میں تو آپ سے شادی کرنے کو سال بھر سے تیار ہوں۔ آپ ہی نہیں کرتے۔

مرد۔ تم شادی کرنے پر تیار ہو۔ اور جناب کی نوکری؟

عورت۔ وہ بھی رہے گی۔

مرد۔ لیکن میں تو یہ بات گوارا نہیں کر سکتا کہ میری بیوی نوکری کرتی پھرے نہ گھر کی دیکھ بھال کرے نہ بچوں کا خیال کرے اور صبح ہی صبح اٹھ کر کام پر سدھار جائے۔

عورت۔ آپ بھی تو صبح اٹھ کر کام پر سدھار جائیں گے۔ تو میں سارا دن کیا مکھیاں مارا کروں گی۔

مرد۔ گھر میں کچھ کام ہوتا ہے یا نہیں۔ آخر گھر کی دیکھ بھال۔ ۔ ۔ ۔

عورت۔ ہوں! آپ دفتر جائیں اور میں گھر کا کونہ کونہ جھانکتی پھروں۔

مرد۔ میں نے یہ کب کہا۔ آخر گھر میں بھی تو کام ہوتے ہیں۔

عورت۔ مثلاً

مرد۔ بھئی یہی گھر کی دیکھ بھال۔ آخر ہماری مائیں بھی گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں یا نہیں۔

عورت۔ تو چولھا جھونک لیا کروں۔

مرد۔ میں نے یہ کب کہا۔

عورت۔ تو کیا آپ کا مطلب گھر کی دیکھ بھال سے کیا ہے؟

مرد۔ بھئی مجھے [illegible]۔ تم نے بس اب یہ عادت ڈال لی ہے کہ جہاں میں تم سے ملنے آیا اور تم نے ٹانگ لی۔

www.taemeernews.com

عورت۔ اچھا اگر آپ کو میری آواز پسند نہیں تو لیجئے میں خاموش بیٹھی جاتی ہوں۔۔۔۔ بتایئے نہ کیا سچ مچ آپ کی شادی ہو رہی ہے۔ یا بس مجھ پر ہی رعب گانٹھا کرتے ہیں۔

مرد۔ ہو ہی جائے گی۔ کوئی جاب ہی تو اس دنیا میں اکیلی عورت نہیں ہیں۔ آپ کو میری اتنی فکر کیوں ہے۔

عورت۔ اس لیئے کہ مجھے بے انتہا محبت ہے۔

مرد۔ جی ہاں محبت ہے! محبت ہوتی تو سال بھر سے کیوں ضد کیئے بیٹھی رہتیں اور اس طرح دِق کرتیں۔۔۔۔ نوکری نہیں چھوڑیں گی۔ آخر رکھا کیا ہے اس نوکری میں۔ کون سا ایک ہزار روپیہ آپ کمایا کرتی ہیں سو روپیہ تو آپ کی تنخواہ ہے۔

عورت۔ کچھ بھی ہو۔ ہے تو یہ میری آزادی کی کنجی۔

مرد۔ یعنی آپ کی آزادی کی جان انھیں سو روپیہ میں ہے۔

عورت۔ سو ہوں یا دو سو اس سے بحث نہیں۔ آزادی کی جان تو اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہونے میں ہے۔

مرد۔ یعنی آپ کو میرا ذرا سا اعتبار نہیں۔ اور آپ سوچتی ہیں کہ میں آپ کو روپیہ بالکل نہیں دوں گا۔

عورت۔ وہ روپیہ لیکن میری اپنی محنت کا کمایا ہوا تو نہ ہوگا۔

مرد۔ عورت کے کمانے سے ہوتا کیا ہے۔

عورت۔ ہوتا کیوں نہیں۔ سنیئے۔ چڑا لایا چاول کا دانہ۔ چڑیا لائی دال کا دانہ۔ دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی۔

مرد۔ نہیں چاہیئے مجھے آپ کی دال کا دانہ۔

www.taemeernews.com

عورت۔ خالی پیاداں تو مجھ سے کھائے نہیں جائیں گے۔

مرد۔ جی ہاں آپ کو تو چٹنی اچار کی ضرورت ہے۔

عورت۔ بالکل ٹھیک۔

مرد۔ جب دیکھو ایک جمگھٹا آپ کے چاروں طرف لگا رہتا ہے۔ آپ کے پروانے۔

عورت۔ ان کو تو آپ ہرگز گھر میں گھسنے نہ دیں گے۔

مرد۔ بالکل نہیں۔

عورت۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ سب میرے دوست ہیں۔

مرد۔ جی ہاں بڑے دوست ہیں۔

عورت۔ تو پھر ان لوگوں کو تو آپ گھر میں گھسنے نہ دیں گے۔

مرد۔ جی ہاں مجھے ان سے سخت نفرت ہے۔

عورت۔ کیوں؟

مرد۔ بس یہ اپنی اپنی طبیعت۔

عورت۔ تو مجھ کو آپ پردے میں کیوں نہ بٹھا دیں۔

مرد۔ دل تو یہی چاہتا ہے لیکن آپ مانیں گی۔

عورت۔ میں تو اور بھی بہت سی باتیں نہیں مانوں گی۔

مرد۔ خیر آپ کوئی بات مانیں یا نہ مانیں لیکن میں یہ جمگھٹا گوارا نہیں کرسکتا۔

عورت۔ تو پھر ہمارے گھر میں کون لوگ آیا کریں گے۔؟

مرد۔ وہی جو کامن فرینڈز (Common Freinds) ہوں۔ یعنی دونوں کے مشترکہ دوست۔

عورت۔ ہوں! مسٹر اور مسز سیٹھی اور مسٹر صفدر۔

www.taemeernews.com

مرد ۔ کیوں! وہ کیوں نہیں آئیں گے۔

عورت ۔ اس لئے کہ وہ مجھ کو سخت ناپسند ہیں ۔

مرد ۔ کیوں! وہ تم کو کیوں ناپسند ہیں ۔

عورت ۔ بس ہیں ۔

مرد ۔ کیوں ۔

عورت ۔ اپنی اپنی طبیعت !

مرد ۔ تم تو بالکل بچوں کی سی باتیں کرتی ہو ۔

عورت ۔ اور تم ۔

مرد ۔ میں تو ہمیشہ معقول بات کہتا ہوں ۔

عورت ۔ جی ہاں! قربان آپ کی منطق کے ۔ میرے دوستوں سے آپ کو نفرت ہو تو وہ گھر میں نہ گھس سکیں اور آپ کے دوستوں سے مجھے نفرت ہو تو وہ شوق سے آئیں جائیں ۔

مرد ۔ ٹھیک ہے! بیوی صاحبہ صبح سے شام تک نوکری پر سدھاریں شام کو جب ہم تھک تھکا کر دفتر سے واپس آئیں اور دو گھڑی دل بہلانا چاہیں تو بیوی صاحبہ واپس تو آئیں لیکن ساتھ ہی دوستوں کا ایک ریوڑ بھی لائیں ۔ یہ ہے آپ کے دماغ میں گھر کا نقشہ ۔

عورت ۔ اور آپ کے دماغ کا نقشہ کیا ہے ؟ بیوی ہو ۔ صبح جب آپ دفتر جائیں جلدی جلدی آپ کو جگا کر گدھا بنا کر دفتر بھیجے ۔ دن بھر گھر کے پیچھے ڈنڈے لے کر گھومے جو وقت ملے آپ کے نام کی مالا جپے ۔ اس بے کاری کی قید کا نام آپ نے گھر کی دیکھ بھال رکھا ہے اور پھر جب دفتر سے تھک تھکا کر بدمزاجی کرتے ہوئے گھر آئیں تو آپ کا دل

www.taemeernews.com

خوش کرے۔ شام کو صفدر صاحب اور مسز سیٹھی کی ہاں میں ہاں ملائے

مرد۔ یہ میں نے کب کہا۔

عورت۔ اور آپ نے کیا کہا۔

مرد۔ میرا تو صرف یہ مطلب ہے کہ دوسری عورتوں کی طرح آپ بھی رہیے گھر کی دیکھ بھال۔

عورت۔ پھر وہی گھر کی دیکھ بھال۔

مرد۔ جی ہاں گھر کی دیکھ بھال۔

عورت۔ میں نوکری چھوڑ کر اپنی آزادی نہیں بیچ سکتی۔

مرد۔ آپ کی آزادی۔

عورت۔ جی ہاں میری آزادی۔

مرد۔ آپ نوکری کرتی پھریں اور گھر میں بچے روتے پھریں۔

عورت۔ بچے شادی ہوتے ہی تھوڑی ہو جائیں گے۔

مرد۔ آخر کبھی تو ہوں گے ہی یا آپ کو ان کی پیدائش سے بھی انکار ہے۔

عورت۔ نہیں مجھے تو انکار نہیں۔

مرد۔ اور جب ہوں گے تب آپ نوکری چھوڑ دیں گی۔

عورت۔ نہیں۔ جب بھی نہیں چھوڑوں گی۔

مرد۔ کیا میں آپ سے پوچھ سکتا ہوں کہ ان کی دیکھ بھال کون کرے گا؟

عورت۔ میں اور آپ دونوں مل کر۔

مرد۔ عورت کا پہلا فرض بچوں کی پرورش ہے۔

عورت۔ اور مرد کا پہلا فرض بچوں کا حقدار ہونا ہے۔

مرد۔ کیا مطلب؟

181
www.taemeernews.com

عورت۔ مطلب یہ کہ عورت کو بچے پالنے کا حکم تو لگا دیا لیکن بچے ہوتے کس کی ملکیت ہیں۔

مرد۔ باپ کی

عورت۔ تو پھر میں ان کو کیوں پالوں۔ جس کی ملکیت ہو وہ خود ان کو پالے۔

مرد۔ کیا عجیب باتیں کرتی ہو۔

عورت۔ اس میں عجیب کی کیا بات ہے۔

مرد۔ عجیب نہیں تو اور کیا؟ اب بچے پالنے سے بھی تمھیں انکار ہے۔

عورت۔ مجھے ہو یا نہ ہو تمھیں تو ہے۔

مرد۔ میرا کام بچے پالنا نہیں روپیہ کمانا ہے۔

عورت۔ روپیہ تو میں بھی کماؤں گی۔

مرد۔ ہوں۔ روپیہ کماؤ گی۔ سو روپیہ پر اتنا ناز ہے جو کہیں زیادہ ہوتے تو نہ معلوم کیا آفت ڈھاتیں۔

عورت۔ تو اچھا فرض کرو کہ تمھاری تنخواہ سو روپیہ ہوتی اور میری آٹھ سو۔ تو نوکری کسے چھوڑنی چاہیئے تھی۔ تمھیں یا مجھے؟

مرد۔ تمھیں۔

عورت۔ کیوں؟

مرد۔ اس لئے کہ میں مرد ہوں یا عورت۔

عورت۔ تو تم ہر دفعہ اپنے ہی کو بڑا سمجھتے ہو۔

مرد۔ میں کیا سمجھتا ہوں۔ قدرت نے ہی مجھ کو بڑا بنایا ہے۔

عورت۔ میں تو تم کو اپنے سے بڑا نہیں خیال کرتی۔ تو پھر تم کیوں ایک ایسی عورت سے شادی نہیں کر لیتے جو رات دن تمھاری پوجا کیا کرے۔

182
www.taemeernews.com

مرد۔ کر ہی لیں گے ۔ کوئی ایک آپ ہی تو دنیا میں نہیں ۔
عورت۔ تو پھر جائیے نا! روز کیوں آکر میری جان کھا جاتے ہیں ۔
مرد۔ (ٹھہر کر) بڑا محبت کا دم بھرتی ہیں ۔
عورت۔ اور آپ بھی تو بھرتے ہیں۔
مرد۔ (ٹھہر کر) اچھا یہ سب تو ہوا۔ اب بتاؤ شادی کب کرو گی ۔
عورت۔ لیکن اپنی نوکری نہیں چھوڑوں گی ۔

www.taemeernews.com

سلمیٰ

یہ کہانی ایزابیلا تھوبرن کالج، لکھنؤ کے سہ ماہی مجلّے "خیابانِ گرانیکل" کے لیے لکھی گئی اور ۱۹۳۲ء میں مس ایم۔ اے ڈیمنٹ کی طرف سے شائع ہونے والے افسانوی مجموعے

"When the tom-tom beats"

میں دوبارہ چھپا۔ یہ کہانی غالباً رشید جہاں (رشید عبداللہ) نے ۱۹۲۳ء میں لکھی تھی کیوں کہ انٹرمیجیٹ سائنس کی طالبہ کی حیثیت سے وہ ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۴ء کے درمیان اس کالج میں رہیں۔

Translated into Urdu from the original by: Prof A.A Saroor
Department of Urdu, A.M.U.
ALIGARH

www.taemeernews.com

اقبال جب انگلستان گیا تھا تو یونہی لڑکا سا تھا لیکن سات برس بعد جب واپس آیا تو بوڑھی ماں کو ایک اونچا پورا مرد دکھائی دیا۔ بیوہ ماں کو اب اگر کوئی ارمان تھا تو بس یہی کہ بیٹے کی شادی کر دیں اور اسے خوش و خرم دیکھیں خاندان میں کئی لڑکیاں تھیں جنھیں وہ اپنے بیٹے کے لیے چن سکتی تھیں لیکن ان کی نظر انتخاب اپنے بھائی کی بیٹی سلمیٰ پر پڑی۔ انھوں نے سلمیٰ کو محض اس کے حسن کی وجہ سے پسند نہیں کیا تھا اس کی شائستگی اور نرم دلی کی قدر و قیمت ان کی نگاہ میں کہیں زیادہ تھی۔ ہر ہندوستانی ماں بیٹے کے پیار کی غلام ہوتی ہے۔ یہی حال بیگم حبیب کا تھا۔ باقی ماندہ زندگی وہ بیٹے ہی کے ساتھ گزار دینا چاہتی تھیں اور وہ جانتی تھیں کہ ان کی بھتیجی سلمیٰ ماں اور بیٹے کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کی تکلیف کبھی نہ اٹھائے گی۔ اقبال ایک نوجوان بیرسٹر تھا۔ خوش اطوار اور مہذب۔ اس لیے سلمیٰ کو پانے میں کوئی دقت نہیں تھی اور جیسا کہ پہلے ہی سے سب کو اندازہ تھا، بیگم حبیب کی تجویز سلمیٰ کے والدین نے قبول کر لی۔

منگنی سے پہلے رشتہ کی دوسری بہنوں کی طرح سلمیٰ بھی اقبال کے سامنے آتی جاتی تھی۔ اب معاملہ دوسرا تھا۔ اقبال سے پردہ کرنا اس کے لئے اب ضروری تھا۔ مسلمانوں میں نوجوان لڑکیاں جب کہ منگنی رشتے کے بھائیوں میں ہوتی ہے، خوب سمجھتی ہیں کہ انھیں آنکھ مچولی کا کیسا کھیل کھیلنا پڑے گا۔ سلمیٰ کو بھی دوسری لڑکیوں کی طرح یہ کھیل پسند آیا اور اس نے اپنی عزیز ترین سہیلی جمیلہ سے کہا۔

"ہم دروازے پر تقریباً آمنے سامنے آ گئے تھے۔ لیکن میں اندر بھاگ گئی اور میں نے دیکھا کہ وہ مسکرا رہا تھا۔ مجھے اس کے سامنے آنا پڑا تو کیا کروں

185 www.taemeernews.com

گی ؟" اس لئے سوال کیا اور پھر اس تصور سے اسے جھرجھری آگئی۔

جمیلہ کو چھیڑنے میں مزہ آتا تھا۔ بولی" میں تمھاری بات کچھ نہیں سکی۔ تم نے نام تو بتایا ہی نہیں۔ تمھارا اشارہ بخشی کی طرف ہے۔ یا اس بوڑھے کی طرف جو پچھلے سال تم سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ کیا وہ بہت کھوسٹ ہے ؟"

بخشی یا کسی اور سے مجھے کیا مطلب ؟ تم خوب جانتی ہو کہ میرا اشارہ کس کی طرف ہے "

سلمیٰ نے یہ کہتے ہوئے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا۔

" میں بالکل نہیں جانتی کہ تمھارا مطلب کس سے ہے۔ تم نے صاف بتایا ہی نہیں۔ میں نے تو خود ہی اندازہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ کیا میرا قیاس غلط نکلا ؟"

" افوہ جمیلہ، اتنی زور زور سے ہم باتیں نہ کریں۔ اگر لوگوں کو پتہ چل گیا کہ میں اس کے بارے میں باتیں کر رہی تھی تو کیا سوچیں گے۔ دیکھو امامن آرہی ہے "۔

" امامن ! ابھی تمھارا یہاں کوئی کام نہیں۔ جب بھی کوئی ضرورت ہوگی ہم تمھیں بلا لیں گے "۔

جمیلہ بڑے سنجیدہ چہرے اور شرارت بھری آنکھوں کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ پھر اس کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولی" اب بتاؤ، بیوقوف حسینہ تم جو منگنی کے بعد سے آٹھوں پہر آئینے کے سامنے جمی رہتی ہو۔ کیا تم اقبال سے پیار نہیں کرتیں ؟ اس نے کہا ہے کہ میں تم سے معلوم کروں "۔

" تم کتنا تنگ کرتی ہو جمیلہ ؟ یہ سوال کس قدر مہمل ہے۔ بہت جلد

186 www.taemeernews.com

تم بھی اسی کشتی پر سوار ہونے والی ہو۔ پھر پوچھوں گی۔ اور تم مجھے بیوقوف کیوں سمجھتی ہو۔ میں ہمیشہ سے دن بھر میں بس ایک بار آئینے کی صورت دیکھتی ہوں۔ اب تم خود ہی اپنے آپ کو دیکھ رہی ہو"۔

"میں ذرا تم سے موازنہ کر رہی تھی۔ اس میں کیا شک ہے کہ تم مجھ سے زیادہ خوبصورت ہو۔ وہ کتنا خوش نصیب ہوگا؟ کیوں؟ ہے کہ نہیں؟ — اور مجھ بیچاری کی بات، مسخروں جیسی شکل تم بیس برس کی لگتی ہو اور میں چودہ کی۔ ویسے ہماری عمر کتنی ہے؟"

"سولہ، بلکہ تم دو مہینے چھوٹی ہو"۔

آپس میں گفتگو میں اقبال ہی موضوع بنتا تھا۔ کیوں کہ سلمیٰ اور کسی سے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس کی بہن ناظرہ صرف گیارہ برس کی تھی اس لئے اس کی ہمراز صرف ایک ہی تھی، جمیلہ، اس کی سہیلی۔

ہندوستانی لڑکی کو ہونے والے شوہر کی طرف سے بے نیازی کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ اور اس سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ کسی سے اس کے بارے میں ایک لفظ بھی کہے جہاں تک اس کی شریر سہیلی کا تعلق ہے۔ وہ اقبال کے سامنے اسکتی تھی اور اس جوڑے کے سامنے مذاق سے بھی نہیں تھکتی تھی۔ یہ سب اس وقت ہوتا جب خاندان کے بزرگوں میں کوئی موجود نہ ہوتا وہ انھیں تنگ کرنے کی نئی نئی ترکیبیں سوچتی لیکن اس کی اور ناظرہ کی اداکاری والے چھوٹے چھوٹے ڈرامے سب سے زیادہ کامیاب ہوتے۔ صبح سے شام تک ان کی اداکاری کا ریہرسل جاری رہتا۔ سلمیٰ اور اقبال کی حیثیت تماشائیوں کی ہوتی۔ اقبال نے کئی بار جمیلہ سے کہا تھا کہ وہ ایک پیدائشی اداکارہ ہے۔

187 www.taemeernews.com

اور اس کی خواہش ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر کسی اسکول میں جا کر تعلیم حاصل کرے۔ ان تحسینی کلمات کے ساتھ وہ بڑی فروگی کے ساتھ یہ بھی کہتا۔ "جمیلہ تمھیں انگریزی سیکھنی چاہیئے تمھاری فارسی اور عربی اب خلاف فیشن ہو چکی ہے۔

جمیلہ بڑی بے باکی سے جواب دیتی! "آپ ایسا صرف اس لئے کہتے ہیں کہ آپ خود ان زبانوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ سلمیٰ تو ان زبانوں کی عالم ہے، اور میں انھیں اس لئے پڑھ رہی ہوں کہ مجھے زبردستی پڑھایا جا رہا ہے"۔

گو کہ لڑکیاں ہر طرح کوشش کرتیں لیکن اقبال ان لوگوں میں نہیں تھا۔ جنھیں پریشان کیا جا سکے۔ وہ ہر مذاق کو ہنس کر جھیل جاتا۔ مرچوں بھرے پان کھا جاتا اور سادے پانی کی جگہ نمک کا محلول بھی چڑھا جاتا۔ چہرے پر ذرا سی تبدیلی لائے بغیر۔ جمیلہ سلمیٰ کے نام سے اسے پھولوں کا تحفہ دیتی اور اسے سلمیٰ کے کمرے میں جانے کا حکم دیتی۔ پھر اونچی آواز میں کہتی "دیکھو سلمیٰ یہ نہیں آ رہے ہیں۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ ان سے پٹنا بہت مشکل ہے۔ اب تم اس وقت تک نئے گجرے انھیں نہ بھیجنا جب تک کہ یہ خود انھیں لینے کے لئے نہ آئیں۔ میں تمھاری جگہ ہوتی تو اب ایک بھی نہ بناتی"۔ سلمیٰ اپنے کمرے میں خفیف ہوتی رہتی۔ ہار اسی لئے بنایا تھا لیکن وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا نام لیا جائے۔

اقبال کی بیشتر شامیں اپنے چچا کے گھر پر گزرتیں۔ ناظرہ ایک خاموش طبع لڑکی تھی اور اگر جمیلہ موجود نہ ہوتی تو وہ زیادہ دیر تفریح میں شریک نہ ہوتی وہ شامیں انتہائی خوشگوار ہوتی تھیں جب وہ اقبال کے ساتھ تماشے کرتی یا

188

www.taemeernews.com

اسے ہنساتی۔ اقبال نے لڑکیوں کو کئی انگریزی کھیل سکھائے تھے ان میں سب سے دل چسپ بیڈمنٹن تھا۔ کبھی کبھی بیگم جیب بھی اس کھیل میں شریک ہو جاتیں۔ جمیلہ کا پسندیدہ کھیل شطرنج تھا۔ وہ اس میں کسی کو بھی ہرا سکتی تھی اقبال کو ہرانے میں اسے خوب مزہ آتا جو محض جمیلہ کو خوشی سے کھلکھلاتے تالیاں بجاتے دیکھنے کے لئے جان بوجھ کر غلط چالیں چل دیتا تھا۔

پھر ایک دن ایسا آیا جب سلمیٰ کی سہیلی پندرہ روز کے لئے وطن چلی گئی کیونکہ اس کی بہن آئی ہوئی تھیں وہ واپس لوٹی تو بہت زیادہ بدل چکی تھی گو وہ اب بھی ہنستی تھی، مذاق کرتی تھی اور کھیلتی تھی لیکن بیشتر اوقات میں وہ اتنی خاموش اور سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آتی تھی جتنی پہلے کبھی نہیں دکھائی دی تھی۔ سلمیٰ یہ سمجھتی تھی کہ اسے جمیلہ کی اداسی کا سبب معلوم ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جمیلہ اس سے جدا ہونے کے تصور سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ اس کا اثر اس کی صحت پر بھی پڑ سکتا ہے کاش میں اسے بھی اپنے ساتھ لے جا سکتی۔ وہ جب بھی جمیلہ کا اداس چہرہ دیکھتی تو بار بار یہ بات دوہراتی۔

"جمیلہ کیا تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ تم پہلے کی طرف اب ہنستی کیوں نہیں، ذرا اپنا چہرہ دیکھو کیسا زرد ہو گیا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں بہتر ہوگا کہ تم ڈاکٹر نارولکر سے مشورہ کرو۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں تم میری فکر نہ کرو۔ دیکھو میرے بازو کتنے گول ہیں مجھے خود پتہ نہیں کہ ان دنوں میں اتنی بدلی بدلی سی کیوں ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ ....."

مجھے پتہ ہے کہ تمھاری الجھن کیا ہے تم سے جدا ہونا میرے لئے بھی انتہائی تکلیف دہ ہے لیکن میں برابر آتی رہوں گی۔ ہو سکتا ہے کہ عائشہ کی

189
www.taemeernews.com

شادی میں جلد ہی آنا ہو"۔

"کیا مطلب ہے کیا تم شادی کے فوراً بعد ہی چلی جاؤ گی؟"

"کیا تم نے نہیں سنا کہ ہم کلکتے چلے جائیں گے۔"

"میں نے تو یہ سنا تھا کہ کچھ دنوں بعد تم شاید جبل پور چلی جاؤ۔ کلکتہ کے بارے میں تم نے کبھی نہیں بتایا"۔

"ہاں، جب یہ طے ہوا تھا کہ تم یہاں نہیں تھیں اس کے علاوہ بھی تم سے بہت سی باتیں کہنی ہیں سب سے اہم بات تو یہی ہے۔ تم جانتی ہو کہ اقبال کو جبل پور میں ایک ملازمت مل رہی تھی اور اب کلکتہ سے ایک آفر ہے۔ انھوں نے جبل پور پر اسے ترجیح دی ہے اور اسے منظور بھی کر لیا ہے کاش وہ یہیں وکالت شروع کر دیتے۔ ہم شادی کے دوسرے ہی ہفتے روانہ ہو جائیں گے۔ پھوپھی بھی میرے ساتھ جائیں گی"۔

"یہ تو بہت اچھا ہے۔ کاش میں بھی تمھارے ساتھ چل سکتی، میں جہاز دیکھنا چاہتی ہوں، سمندر دیکھنا چاہتی ہوں اور بہت سی ایسی چیزیں جو یہاں نہیں ہیں۔ جب چاروں طرف یہ اونچی اونچی دیواریں نظر آتی ہیں تو میں خود کو ایک قیدی تصور کرتی ہوں"۔

"میری یہ بھی خواہش تھی کہ تم چلتیں، خیر میں کسی نہ کسی طرح انتظام کروں گی"۔ پھر وہ تبسم کے ساتھ کہتی! "تمھارے لئے میں ایک کالا کلوٹا نکالی ڈھونڈوں گی۔ تب تم اپنی ہر آرزو پوری کر سکو گی اور اس قید سے باہر نکل سکو گی۔ مجھے یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے میلوں دور ہوں گے۔ سچ کہو جمیلہ، تمھیں کیسا لگتا ہے؟"

"میں — میں خوش ہوں کہ تمھیں دنیا دیکھنے کا موقع ملے گا"۔ جمیلہ

www.taemeernews.com

کھوئی کھوئی سی بولی ۔ سلمیٰ نے جس کی آنکھیں بھر آئی تھیں تشکر آمیز لہجے میں کہا "شکریہ میری بہن! تم اپنے سے پہلے میری خوشی کے بارے میں سوچتی ہو۔ لیکن مجھ سے جدا ہونے کے خیال سے تم خوش نہیں ہو۔ مجھے بھی تمہارے بغیر کوئی لطف نہ ملے گا۔ اور ــــ" اتنا کہتے کہتے وہ اپنے بازو جمیلہ کی گردن میں حمائل کردیتی اور جمیلہ جو پہلے ہی سے ہچکیاں لے رہی ہوتی' اسے دیکھ کر سلمیٰ بھی رونے لگی۔ سلمیٰ جو اپنے والد کے گھر سے کبھی الگ نہیں ہوئی تھی۔ سوائے ان چند دنوں کے جب وہ اپنی نانی کے پاس چلی گئی تھی' اب اسے یوں لگتا تھا جیسے کسی دور دراز ملک کو جا رہی ہے۔ اپنی سہیلی کو چھوڑنے کا خیال اس کے لئے اتنا ہی اذیت ناک تھا جتنا یہ کہ وہ اقبال کے ساتھ نہ جائے۔

جلد ہی گھر میں رشتے داروں کی بھیڑ لگ گئی۔ رات دیر گئے تک ڈومنیاں شادی کے گیت گاتیں۔ ڈھول کے شور اور عورتوں کی پازیب کی جھنکار سے فضا گونجتی رہتی۔ سلمیٰ کے لئے اپنے اپنے گھر کی مالکہ بننے میں ابھی دو ہفتے کا عرصہ تھا اسے ایک کمرے میں مایوں بٹھا دیا گیا جہاں خاندان کی جوان لڑکیوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ اقبال کے گھر والوں میں کسی کو اس کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ایک روز آدھی رات کو جب سلمیٰ جاگ رہی تھی اس نے اپنے اوپر جھکی ہوئی اماں کی سرگوشی سنی"۔ بڑی بٹیا بڑی بٹیا!"

"کیا ہے اماں؟"

"اقبال میاں نے یہ خط بھیجا ہے۔ بٹیا آپ ہمیں اکیلے کبھی دکھائی نہ دیں۔ کوئی نہ کوئی ہر وقت ساتھ نظر آیا' بٹیا کسی سے یہ بتایئے گا نہیں۔ نہیں تو بیگم صاحب ہمیں نکال باہر کریں گی۔ اس بڑھاپے میں ہم کہاں جائیں گے ــــ؟"

191
www.taemeernews.com

"امامن یہ بڑے شرم کی بات ہے کہ ایک پرانی خادمہ ہوتے ہوئے تم ایسی حرکتیں کرو۔ کل کو تم کسی دوسرے کی طرف سے ناظرہ کے لئے بھی خط لا سکتی ہو۔ یہ خط اقبال کا ہے اس لئے میں اس کی وجہ سے کوئی بے عزتی محسوس نہیں کرتی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خط واپس کر دوں یا رکھ لوں"۔

"میرا خیال ہے مجھے یہ خط رکھ ہی لینا چاہیئے"۔ اس نے ایک لمحے بعد فیصلہ کیا۔ ساری گفتگو سرگوشیوں میں ہوئی تھی۔

اس کمرے میں اس کے علاوہ سونے والے دو تین اور تھے خط کو وہاں پڑھنے کے خیال سے وہ ڈر گئی۔ ناظرہ اور جمیلہ ایک دوسرے کمرے میں فرش پر سو رہی تھیں کیوں کہ پلنگ مہمانوں کو دے دیئے گئے تھے۔ گھر کی اوپری منزل متوقع مہمانوں کے لئے خالی پڑی ہوئی تھی۔ ایک موم بتی لے کر وہ کوٹھے پر چڑھ گئی۔ کمرے میں فرش پر بچھے ہوئے دبیز قالینوں اور لمبے لمبے تکیوں کے علاوہ بہت تھوڑا سا فرنیچر تھا۔ اس کی الجھن یہ تھی کہ خط کو کھولے کیسے؟ اقبال نے شاید اس کے زیورات کے بارے میں پوچھا ہوگا یا یونہی کوئی دل چسپ بات ہوگی تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس نے لفافہ چاک کیا اور پڑھنے لگی:

"میری پیاری سلمیٰ!

شادی سے پہلے میری جانب سے یہ خط دیکھ کر تمہیں حیرت ہوگی۔ میں پہلے ہی تمہیں لکھنا چاہتا تھا لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بھیجوں کیسے۔ امامن کی مہربانی ہے کہ وہ اسے تم تک پہنچانے پر رضامند ہوگئی۔ دو ہفتوں کے اندر اندر ہم میاں بیوی بن جائیں گے اور ہم دونوں کا یہ فرض ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ صاف گوئی اور کھلے دل سے پیش آئیں۔ جب میں نے تم سے شادی کی عامی بھری

192
www.taemeernews.com

اس وقت میں ایک آزاد انسان تھا، ایک آزاد دل کا مالک۔ تمھیں میرے سامنے آنے کی اجازت نہیں تھی جبکہ مجھے جمیلہ کے ساتھ جسے اب میں پیار کرنے لگا ہوں تفریح کا پورا موقع حاصل تھا اس سلسلے میں کسی سے ایک لفظ بھی کہنا ناممکن ہے لیکن میں تمھیں یہ سب بتائے بغیر تم سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم اسی طرح شادی کریں گے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے لئے ایک اچھا شوہر ثابت ہوں گا۔

اقبال محمد حسین

وہ خط کو گھورتی رہی اور ایک لمحے کے لئے اس کا ذہن بالکل خالی ہو گیا اسے یوں محسوس ہوا جیسے یہ ایک خواب تھا۔ "یہ کبھی بھی کیونکر ہو سکتا ہے۔ یہ کبھی بھی کیوں کر ہو سکتا ہے ——— وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔" ہاں میں خواب دیکھ رہی ہوں پگھلا ہوا موم اس کے ہاتھ پر گرا وہ پوری طرح ہوش میں آ گئی۔

"نہیں میں جاگ رہی ہوں" اس نے اپنے آپ سے کہا "اور یہ اس کا خط ہے۔ اوہ، جمیلہ، میں تمھیں اپنی بہن ناظرہ سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ اس گھر کا ہر فرد تمھارے ساتھ یوں پیش آتا تھا جیسے تم اس گھر کی بیٹیوں میں سے ایک ہو اور تم نے مجھے ان باتوں کا کیا صلہ دیا ہے! اب مجھے تمھاری اداسی کی اصل وجہ معلوم ہوئی ہے، تم مجھے خوش دیکھ کر اداس تھیں" غمزدہ لڑکی ایک تکیے پر گر پڑی اور زار و قطار رونے لگی۔

"کیا کیا منصوبے میں نے بنائے تھے؟ جمیلہ نے آخر مجھے بتا کیوں نہ دیا؟ لیکن وہ اپنے آپ کو کیا کر سکتی تھی وہ اپنے پر کشش ہونے کو کیا کر سکتی تھی؟ "سلمیٰ سچائیاں لینے لگی۔ اس نے سوچا کہ اب اسے ایک ایسے شخص سے شادی کرنی ہے جو اس سے محبت نہیں کرتا۔ اور وہ سمجھ گئی کہ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ

www.taemeernews.com

کس سے مشورہ لے؟ اگر وہ اپنی ماں کے پاس جاتی ہے تو ایک معصوم لڑکی کی عزت برباد ہو جائے گی اگر وہ اقبال کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کرتی ہے جس کا اسے پورا حق حاصل ہے تو اس کے باپ کی نیک نامی پر حرف آئے گا۔ اگر وہ اقبال سے انکار کے لئے کہتی ہے تو اس کا مطلب اس کے والد اور پھوپھی کے تعلقات ختم کرنا ہوگا۔ ان حالات میں ایک لڑکی کیا کر سکتی ہے؟ چپ چاپ بیٹھ کر اپنی قسمت اور رسموں کو کوستی رہے؟ اس نے زہر کھانے کا ارادہ کیا۔ پھر اسے چھت سے چھلانگ لگانے کا خیال آیا۔ لیکن اسے اپنے مذہب کی تعلیم یاد آئی جو خودکشی کو ممنوع قرار دیتی ہے۔ پھر وہ کیا کرے؟ ایک مسجد کے مینار سے اذان کی صدائے فجر کی ساعت کا اعلان کیا۔ اس نے نماز پڑھنے کی کوشش کی لیکن اپنے خالق کا نام لینے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ الفاظ اس کے گلے میں پھنس رہے تھے۔ دماغ کے بجائے اس کا دل باتیں کر رہا تھا۔

آخرکار جھٹپٹے کے وقت سلمیٰ اٹھی لیکن وہ سیڑھیوں سے بغیر روشنی کے اتر رہی تھی۔ اچانک اس کا پیر پھسل گیا اس سے پہلے کہ وہ اٹھتی اس نے جمیلہ کو دیکھا

"اف! میری مدد کرو کہ میں اٹھ سکوں۔ بری طرح چوٹ آئی ہے۔"

"بری طرح چوٹ! کیوں تم زیادہ اونچے سے نیچے گریں۔ اس سے پہلے کہ تمھارے شوہر کو یہ بات معلوم ہو میں تمھاری مدد کرتی ہوں۔"

"جمیلہ میں اٹھ نہیں سکتی۔"

"آخر بات کیا ہے۔ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں کیا؟ تم رو رہی تھیں۔ ناظرہ! ایک بستر لاؤ۔ تمھاری بہن گر پڑی ہیں۔"

"میں چلنے کی کوشش کروں گی۔"

ایک بستر لایا گیا اور اسے اس پر بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کے

www.taemeernews.com

گرد ایک بھیڑ اکٹھا ہو گئی" یہ اکیلے چھت پر کیوں گئی تھیں؟ یہ آخر گری کیسے؟ اس طرح کے سوالات کئے جا رہے تھے۔ سلمیٰ کی والدہ آئیں تو انھوں نے تمام نوکروں کو وہاں سے باہر بھیج دیا۔

"سلمیٰ تم کہاں سے گر پڑیں؟ کیا زیادہ چوٹ لگی ہے؟ جمیلہ ڈاکٹر کو بلانے کے لئے آدمی بھیجو۔ اسی لئے میں اپنی لڑکیوں کا اکیلے اوپر جانا پسند نہیں کرتی۔ لیکن وہ مانتی کب ہیں؟"

"یہ نیچے آ رہی تھیں اور جب تین سیڑھیاں بچ رہی تھیں انھوں نے اوپر کی طرف دیکھا اور گر پڑیں۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ انھیں چوٹ بھی لگی ہے"۔ جمیلہ نے کہا۔

آدھے گھنٹے کے اندر لیڈی ڈاکٹر آ گئی۔ وہ جوان تھی اور سلمیٰ کو بہت پسند کرتی تھی۔

"کہئے بیگم صاحبہ! کون بیمار ہے؟"

"سلمیٰ! وہ اندر ہے اور آپ کو خود ہی بتا دے گی۔ میرا خیال ہے کہ اسے بہت زیادہ چوٹ نہیں لگی ہے۔ وہ اس کمرے میں ہے"۔

"پلیز! سب کمرے سے باہر نکل جائیے تاکہ ذرا صاف ہوا کا گزر ہو"۔ ڈاکٹر نے سلمیٰ کی مزاج پرسی کے بعد لوگوں سے کہا پھر سلمیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی: اب یہاں صرف میں ہوں۔ تم اچھی طرح خود کو اب دکھا سکتی ہو"۔

سلمیٰ نے اپنے گرنے اور چوٹ لگنے کے بارے میں بتایا لیکن وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا باقاعدہ معائنہ ہو یا اسے چھوا جائے چنانچہ ڈاکٹر نے کچھ ہدایتیں دیں اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی۔

شام کو جب ڈاکٹر دوبارہ آئی تو اس نے اپنے مریض میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی

www.taemeernews.com

"آخر تم اچھی طرح مجھے دیکھنے کیوں نہیں دیتیں؟ اس طرح تکلیف اٹھانے اور ڈاکٹر کو خود سے دور رکھنے سے کیا حاصل ہوگا! آؤ، میں تمھیں بہت جلد ٹھیک کر دوں گی۔"

"مجھے شدید چوٹ آئی ہے ڈاکٹر۔ یہ میں جانتی ہوں لیکن میں کوئی علاج نہیں چاہتی۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی۔"

"تم اتنی جلدی دنیا سے بیزار ہوگئیں؟ آخر کیوں؟ ابھی تم نے دنیا دیکھی ہی کتنی ہے؟"

"میں نے اتنا کچھ ضرور دیکھ لیا ہے کہ دنیا سے نفرت کر سکوں۔ ہندوستان میں مسلمان عورتیں آخر کون سے حقوق رکھتی ہیں۔ کسی معاملے میں ہماری کوئی آواز نہیں۔ میں آپ کے اور جمیلہ کے علاوہ کسی اور سے یہ کہنے کی ہمت نہیں رکھتی کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اگر شادی کر دی بھی تو کس سے؟ لوگوں نے میری مرضی کے بارے میں کب پوچھا تھا؟ میری والدہ نے تو پہلے ہی یہ طے سمجھ لیا تھا کہ میں اقبال کے ساتھ خوش رہوں گی۔ آخر کون سا حق۔۔۔"

"سلمیٰ!" ڈاکٹر نے کہا "تم سے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔ پچھلی بار جب میں تم سے ملی تھی تو تمھیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ پھر صرف مسلمان لڑکیاں ہی تکلیف نہیں اٹھاتیں۔ شادی کے مسئلے میں خود ہم بھی کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتے۔ میری شادی بہت کم عمری میں ایک سن رسیدہ شخص سے کر دی گئی تھی جس نے ایک دوسری عورت کے چکر میں مجھے چھوڑ دیا۔"

"اگر آپ خاصی بڑی ہوتیں اور آپ کو پتہ ہوتا کہ وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے پھر بھی آپ کو اس سے شادی پر مجبور کیا جاتا تو آپ کیا کرتیں؟" سلمیٰ نے سوال کیا۔

www.taemeernews.com

"میں اس سے کبھی شادی نہ کرتی"۔
"اگر آپ میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں؟"
"میں کیا جانوں؟ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی"۔
"میرا معاملہ یہی ہے پیاری ڈاکٹر۔ ابھی پچھلی ہی رات مجھے اس بات کا پتہ چلا۔ مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں" سلمیٰ بچوں کی طرح سسکیاں لینے لگی۔
جمیلہ کے علاوہ اگر کسی اور سے سلمیٰ بے تکلف ہو سکتی تھی تو وہ اس لیڈی ڈاکٹر کی ذات تھی۔ ڈاکٹر اس کی ذاتی دوست بھی تھی اور اس کے خاندان کی تمام عورتوں کی معالج بھی۔
"میں تمھاری ماں کو بتا دوں؟"
"امی۔ پھر وہ آپ کو اس گھر میں کبھی داخل نہ ہونے دیں گی۔ وہ کسی مرد کے ساتھ میرا فارسی پڑھنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ جمیلہ کو اس کی تعلیم کے لیے الزام دیں گی۔ نہیں، آپ ان سے کچھ نہیں کہہ سکتیں۔ میرے والد ذرا مختلف ہیں پچھلے سال انھوں نے اپنی سب سے چھوٹی بہن کی شادی کر دی جو بیوہ تھیں۔ اور انھوں نے اس بات کے لیے سارے خاندان کو اپنا دشمن بنا لیا۔ ابھی پچھلے دنوں انھوں نے ہمیں آپ کے گھر جانے کی اجازت دی۔ لیکن امی کو پتہ چلا تو انھوں نے سواری واپس بھجوا دی"۔
ڈاکٹر نے اچھی طرح اس کا معائنہ کیا اور اس نتیجے پر پہونچی کہ سلمیٰ کے سلسلے میں پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ دلہن کوئی مشورہ کرنے پر آمادہ نہیں تھی اور بیماری کا بہانہ بنا رکھا تھا۔ اس کی والدہ اور سہیلیاں اس کی دیکھ بھال کر رہی تھیں۔ جمیلہ بھی اپنی اداسی کو بھول کر ہر لمحہ اس کی تیمارداری میں لگی رہی اور اس کی صحت کے لیے دعائیں کرتی رہی، اگر

www.taemeernews.com

دولہن نے بستر پکڑ لیا تو شادی کیسے ہو سکتی تھی۔ شادی کی تاریخ ملتوی کر دی گئی
اقبال کلکتہ چلا گیا اس سوال میں الجھا ہوا کہ سلمیٰ کی بیماری فطری ہے یا محض
اس کے خط کا ردعمل۔ اس نے پہلی بار خود کو اپنی مادر وطن کی روایتوں اور رسموں
کی زنجیر میں گرفتار محسوس کیا۔ وہ کیسے کیسے نئے خیالات لے کر انگلستان سے لوٹا
تھا اور کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔ لیکن یہ سارے منصوبے خواب کی طرح گزر گئے۔

"اس ملک میں کوئی شخص آخر کیا کر سکتا ہے؟ اگر کوئی لڑکی کسی مرد سے
شادی نہ کرنا چاہیے تو اسے بستر پکڑنا پڑتا ہے۔ اگر وہ اس سے شادی کرنا
چاہے تو اسے خود کو اس کی آنکھوں سے چھپانا اور اپنی سہیلیوں کو اپنا رول
ادا کرنے کے مواقع فراہم کرنا پڑتا ہے۔" اس نے بڑی تلخی کے ساتھ اپنی بدنصیبی
ہندوستانی روایات کے سر تھوپ دی۔

سلمیٰ کے والد نے جو اپنی بچی کی صحت کی طرف سے بہت متفکر تھے ڈاکٹر
سے علیحدگی میں اس کے بارے میں بات کی۔ وہ انتہائی آزاد خیال انسان تھے
اور اگر ان کی بیوی تیار ہوتیں تو وہ اپنی بیٹی کو مناسب آزادیاں بھی دیتے۔ منگنی
سے پہلے وہ سلمیٰ کی رائے ضرور معلوم کرتے۔ لیکن ان کی بیوی نے کہا تھا۔
"میں ان لوگوں کو اپنی ہنسی اڑانے کا موقع نہیں دینا چاہتی۔ یہ کیسی فضول
بات ہے کہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی سے یہ پوچھا جائے کہ کیا وہ شادی
کرنا چاہتی ہے۔ جب تک میں زندہ ہوں میرے بچوں کے ساتھ تم اس
طرح کی کوئی بات نہیں کر سکتے۔ سلمیٰ تمہاری بہن نہیں ہے کہ شوہر کے
انتقال کے بعد اس کی دوبارہ شادی کر دو۔"

"اگر مجھے کوئی حق نہیں ہے تو سارا انتظام بس تمھیں کو کرنا ہوگا
میں کچھ نہ بولوں گا۔ جہاں تک روپے کا تعلق ہے شادی کے سلسلے میں جتنی

www.taemeernews.com

بھی ضرورت ہوگی منشی جی مجھیں دے دیں گے۔" میاں بیوی میں یہ گفتگو بیٹی کی منگنی کے اعلان سے پہلے ہوئی تھی

ڈاکٹر نارولکر جسے سلمیٰ سے انتہائی ہمدردی تھی۔ انھوں نے ساری باتیں سلمیٰ کے والد کو بتا دیں۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اس معاملے میں غلطی نہ اقبال سے ہوئی نہ جمیلہ سے۔ اس نے یہ غلط بیانی بھی کی کہ سلمیٰ اقبال سے پیار نہیں کرتی تھی اور شروع ہی سے وہ اقبال سے شادی کے خلاف تھی۔

"میں خوش ہوں کہ تم نے یہ ساری باتیں مجھ سے بتائیں۔ سلمیٰ کی ماں سے نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بیٹی کو شادی کے معاملے میں کسی بھی رائے کے اظہار کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر سلمیٰ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تو وہ نہیں کرے گی۔ اب میں اس کی ماں کی کوئی بات اس معاملے میں نہ مانوں گا۔ بہتر ہوگا کہ تم سلمیٰ سے یہ بتا دو تاکہ وہ اپنے کو بلاوجہ رنج نہ پہنچائے میں سب کچھ دیکھ لوں گا۔ اگر اقبال نے سلمیٰ کو لکھنے کے بجائے مجھ سے بات کرلی ہوتی تو شاید بہتر ہوتا۔"

دوسرے دن سلمیٰ کے والد اپنی بہن کے یہاں گئے اور ان سے کہا کہ جب تک سلمیٰ بیمار ہے اس کی شادی کا کوئی سوال نہیں۔ بیگم حبیب اور سلمیٰ کی والدہ کا منصوبہ یہ تھا کہ سلمیٰ ٹھیک ہو یا نہیں لیکن شادی ہو جائے۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ شادی کے بعد وہ بالکل صحت یاب ہوجائے گی۔

انھوں نے بہن کو یہ اجازت بھی دے دی کہ اگر وہ چاہیں تو کہیں اور اپنے بیٹے کی شادی کردیں۔ سلمیٰ کی والدہ کو یہ تفصیل معلوم ہوئی تو چراغ پا ہوگئیں! آخر انھیں کیا حق تھا کہ اپنی بہن کے پاس جاتے اور ان سے یہ

199
www.taemeernews.com

سب کہتے جب کہ میں اقبال سے اپنی بیٹی کی شادی کے لئے وعدہ کر چکی تھی۔"

"ایک باپ اور سرپرست کی حیثیت سے مجھے بھی اتنا ہی حق حاصل تھا۔"

"تم یہ جانتے ہو کہ تمھاری بیٹی کو اقبال سے بہتر شوہر نہیں مل سکتا اور ....."

"میں جانتا ہوں"۔

"تب میں دیکھوں گی کہ بلا کسی تاخیر کے اس کی شادی ہو جائے۔ تم اپنی بہن سے کچھ دن انتظار کے لئے نہیں کہہ سکتے تھے؟"

"میں نے منگنی توڑنے کی کوئی بات نہیں کہی، لیکن اب میں کہتا ہوں کہ وہ ٹوٹ چکی ہے اور اقبال کا رشتہ میری بیٹیوں میں سے کسی سے نہ ہو سکے گا۔"

یہ کہتے ہوئے سلمیٰ کے والد تیزی سے باہر نکل گئے۔ کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اپنی بیوی سے وہ بحث نہیں کر سکتے اور ان کے پیچھے وہ باہر آنے سے رہیں۔

بیگم حبیب کئی بار بھائی کے پاس خفگی کا سبب معلوم کرنے کے لئے آئیں اور کہا۔ "میں سلمیٰ کے لئے جب تک ضروری سمجھا جائے انتظار کر سکتی ہوں۔" خود سلمیٰ کی والدہ نے کئی بار اس کے والد کو بلوایا لیکن وہ جانتے تھے کہ جب تک وہ گھر سے باہر ہیں ان کی بیوی کا ان تک پہنچنا محال ہے۔ اقبال کی ماں کو بھائی کے اس عجیب و غریب برتاؤ سے سخت مایوسی ہوئی۔ آخر کار انھوں نے اپنے بیٹے کو تار دیا کہ وہ گھر آجائے۔

اقبال نے سوچا کہ اب سلمیٰ شاید ٹھیک ہو گئی ہوگی اور اسے شادی کے لئے بلایا گیا ہوگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شادی کے بعد وہ جمیلہ کا سامنا کس طرح کر سکے گا۔ جب وہ گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ اس کا

www.taemeernews.com

خبر مقدم کرنے والے چہرے مسرور نہیں تھے۔ اس کو منگنی کے ٹوٹ جانے کا پتہ چلا۔ بیگم حبیب یہ سوچتی تھیں کہ اقبال کو دیکھ کر اس کے بھائی اپنا فیصلہ بدل دیں گے۔ چنانچہ انھوں نے اقبال کو اپنے بھائی کے پاس بھیجا۔ کچھ دیر دونوں چپ بیٹھے رہے۔ پھر اقبال کے ماموں نے شروعات کی۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم واپس آگئے اقبال۔ تمھیں یہاں تمھاری ماں نے بھیجا ہوگا۔ کیا تم بھی یہ جاننا چاہتے ہو کہ میں نے اپنی بیٹی کی منگنی کیوں توڑ دی؟"

اقبال کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ پھر بولے "میرا خیال ہے کہ تم اس کا سبب جانتے ہوگے۔ تمھیں ایک مجبور لڑکی کو لکھنے کے بجائے مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی"۔

"لیکن ماموں جان، میں یہ سب کیسے جان سکتا تھا؟"

"تم یہ کیسے جان سکتے تھے کہ تمھارے ماموں اس وقت منگنی توڑ دیں گے۔ جب شادی کی ساعت اتنی قریب آچکی ہوگی؟ میں تمھیں الزام نہیں دیتا، کوئی بھی باپ اس طرح انکار کر دیتا۔ یوں اپنی جگہ تم بھی صحیح ہو۔ میری بیوی نے سارے انتظامات کئے تھے۔ انھوں نے سلمیٰ سے کبھی اس سلسلے میں پوچھ گچھ نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ سلمیٰ شروع ہی سے اس رشتے کو نہیں چاہتی تھی۔ ڈاکٹر نارولکر نے مجھے یہی بتایا ہے۔" اپنے بھانجے کے اداس اور شائستہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ماموں کی خفگی میں قدرے کمی آگئی۔

ان کے آخری جملوں سے اقبال کو یہ خیال آیا کہ بدنصیب لڑکی اس کو کس قدر پسند کرتی تھی اور اس نے یہ جھوٹ صرف اس لئے کہا ہے کہ اقبال کو خوش رکھ سکے۔ اس نے کہا "ماموں جان میں سلمیٰ کو اپنی بہن کی

201 www.taemeernews.com

طرح عزیز رکھتا ہوں۔ وہ اتنی شریف اور پاکیزہ ہے کہ میں کسی طرح اس کے لائق نہیں۔ وہ ان دیویوں کی طرح ہے جو نوع انسانی سے بلند تر وجود رکھتی ہیں اور پوری ہندو دنیا جن کی پرستش کرتی ہے۔ وہ ایک الوہی شخصیت کی مالک ہے۔" آخری جملہ اقبال نے بہت ملائم اور متین لہجے میں کہا۔

"اقبال' میں بہت خوش ہوں کہ تم میری بیٹی کے بارے میں اتنی اچھی رائے رکھتے ہو۔ اگر تم میری رائے مانو تو جاکر عورتوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرو۔ میں تم سے اپنے ہی بیٹے کی طرح پیار کرتا ہوں اور میں دیکھوں گا کہ تمھاری شادی تمھاری ہی پسند کی لڑکی سے ہو جائے۔"

اتنا کہہ کر وہ اٹھے اور جانے کے لئے مڑے۔ تبھی انھیں کچھ یاد آیا اور بولے "میں یہ نہیں چاہتا کہ کسی کو سلمیٰ کے نام تمھارے خط کا پتہ چلے۔ لوگوں کو یہی معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ منگنی میں نے توڑی ہے۔